میں سترہ تصنیفات کا ذکر ہے، حضرت شاہ نیاز کا کلام مختصر ہونے کے باوجود منتخب سوز و گداز سے معمور اور عشق حقیقی کا صحیفہ ہے اور اس حیثیت سے اصحابِ ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

کعبؓ بن زُہیر اور قصیدۂ بانت سعاد ۔ مرتبہ و مترجمہ جناب علی محسن صدیقی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۰۴، قیمت ۳/۵۰ پیسے، ناشر مکتبہ اسحاقیہ جونا مارکیٹ، بھول چوک، کراچی۔

حضرت کعبؓ، مشہور جاہلی شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ کے فرزند اور اپنے دور کے نامور شاعر تھے، ان کا سب سے مشہور و مقبول قصیدہ "بانت سعاد" ہے، جو اپنی ادبی حیثیت کی بنا پر عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ کعبؓ اسلام لانے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کیا کرتے تھے، قبول اسلام کے بعد اس کی معذرت اور تلافی کے لیے ایک قصیدہ لکھکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، آپ نے اس کو پسند فرمایا، اور اس کے ایک شعر پر اپنی ردائے مبارک مرحمت فرمائی، اسی کی نسبت سے وہ قصیدہ بردہ مشہور ہے، یہ قصیدہ بار بار چھپ چکا ہے، اب جناب محسن صدیقی استاد تاریخ کراچی یونیورسٹی نے کئی نسخوں کی مدد سے اس کا صحیح متن سلیس اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، اور اس کے لغات کی تشریح اور نسخوں کے اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے، شروع میں حضرت کعبؓ کے حالات، ان کی شاعری اور اس قصیدہ کی خصوصیات پر تبصرہ اور اس کی مختلف شرحوں اور دوسری زبانوں کے ترجموں کا ذکر کیا ہے۔ فٹ نوٹ میں متعدد جاہلی اور مخضرمین شعراء کے مختصر حالات بھی آگئے ہیں، صلح حدیبیہ کا سنہ دو جگہ ۸ھ لکھا گیا ہے، جو غلط ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۵ ماہ ذوقعدہ و ذوالحجہ ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۰ء عدد ۲

مضامین

مقالات

شذرات

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کی وفات کے بعد دارالمصنفین کی مجلسِ انتظامیہ میں ایک رکن کی جگہ خالی ہوگئی تھی، اُس کے گذشتہ جلسہ میں اس کے لئے جناب فخرالدین علی احمد صاحب وزیر حکومت ہند کا انتخاب بالاتفاق ہوا، ان سے اس کی منظوری کی اجازت پہلے مانگی گئی تھی، تو انھوں نے ازراہِ کرم لطف و کرم اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا کہ "دارالمصنفین کی جو خدمات ہیں، اس لحاظ سے اُس کی رکنیت اُن کے لئے باعثِ فخر ہوگی"، اس عنایت بھری تحریر سے اُس کے کارکنوں کی نہ صرف عزت افزائی ہوئی، بلکہ اُن کے کام کرنے کے حوصلے بھی بڑھے، امید ہے کہ آیندہ وہ اس دیرینہ علمی ادارہ کو اپنے مفید مشوروں سے اسی طرح مستفید فرماتے رہیں گے، جس طرح ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم نوازتے رہے،

معارف پاکستان میں بڑی تعداد میں جایا کرتا تھا، لیکن جب سے دونوں ملکوں میں مالی لین دین بند ہوگئی ہے، تو وہاں اس کی طلب کے باوجود خریداروں کی تعداد گھٹتی گئی، پھر بھی اس کے وہاں بہت سے قدر داں موجود ہیں، جن کی سہولت کی خاطر یہ انتظام کیا گیا ہو کہ اس کے چندے یہاں بھیجنے کے بجائے وہیں جمع کر دیئے جائیں، لیکن یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ وہاں کے تقریباً پچھتر ایسے خریدار ہیں، جن کے یہاں رسالہ برسوں سے جا رہا، لیکن انھوں نے اس کے چندے ادا نہیں کئے، ان کو بار بار یاد دہانی کی جارہی ہے، مگر وہ جواب تک دینے کی زحمت گوارا نہیں کرتے، اس لئے مجبوراً اُن کے نام سے رسالہ بند کر دیا گیا ہے، معارف

کے خریداروں کا حلقہ باوقار اور سنجیدہ ہے، اس لئے اُن سے اب بھی توقع ہے کہ وہ تقاضا یا و اکر کے اپنا اخلاقی فرض ادا کریں گے، اور اس رسالہ کو غیر معمولی مالی خسارہ سے بھی بچا لیں گے، اس کے چندے جناب ڈاکٹر سید نبی احمد ہاشمی لکچرار اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سندھ کے پاس جمع ہوا کرتے ہیں،

معارف گذشتہ پچپن ۵۵ سال سے اپنے خاص مسلک اور معیار کے ساتھ نکل رہا ہے، جس سے اردو میں اسلامی علوم و فنون اور زبان و ادب سے متعلق قابلِ قدر ذخیرہ کا اضافہ ہوا ہے، اب تک اس کی یکرنگی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، معلوم نہیں اسی یکرنگی کو برقرار رکھنے ہی پر اکتفا کیا جائے، یا زمانہ کی رفتار کے ساتھ اس میں کچھ نیرنگی بھی پیدا کرنے کی ضرورت آگئی ہے، اس کا فیصلہ معارف کے ناظرین ہی کر سکتے ہیں، اگر وہ اس کے مسلک و معیار کے مطابق مفید مشورے دیں تو اُن پر غور کیا جا سکتا ہے، عام طور سے ہندوستان کے بلند پایہ اور سنجیدہ رسالوں میں یا تو مذہبی یا ادبی مضامین نکلا کرتے ہیں لیکن معارف میں تنوع کی خاطر مذہبی مضامین کے ساتھ علمی، تاریخی اور ادبی مضامین کی بھی اشاعت ہوا کرتی ہے، معلوم نہیں ان سے ہمارے ناظرین کی تشنگی پورے طور پر فرو ہوتی ہے کہ نہیں، اس میں سیاسی مضامین قصداً شائع نہیں کئے جاتے، سائنس کے مقالات بھی اس کے دائرہ سے باہر ہیں، معاشیات، نفسیات اور عمرانیات ایسے موضوع ہیں جن پر اس میں مضامین شائع کئے جا سکتے ہیں، اگر اچھے لکھنے والے مل جائیں گو اس کے خریدار کچھ ایسے بھی ہیں جو یہ لکھ کر اسکی خریداری ختم کر دیتے ہیں کہ وہ اسکو ایک مذہبی رسالہ سمجھ کر منگواتے ہیں، لیکن اس میں زیادہ تر علمی، تاریخی اور ادبی مضامین شائع ہوا کرتے ہیں، اور کچھ خریدار ایسے بھی ہیں، جو یہ لکھتے ہیں کہ وہ اس کو ایک بلند پایہ علمی، تاریخی اور ادبی رسالہ سمجھتے ہیں، لیکن اس میں زیادہ مذہبی مضامین نکلتے ہیں، ان اعتراضات کے باوجود یہ رسالہ اپنا تنوع برابر برقرار رکھتا رہا، اور اگر ضرورت ہوئی تو اس میں مزید تنوع پیدا کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ باہر کے اہلِ قلم بھی تعاون کریں،

صمصام الدولہ شاہنواز خاں کی مشہور و معروف تصنیف مآثر الامراء کی جلد دوم کا اردو ترجمہ ابھی حال ہی میں یہاں موصول ہوا ہے، جو مرکزی اردو بورڈ لاہور سے شائع ہوا ہے، اسکے لائق مترجم اردو کالج کراچی کے پروفیسر محمد ایوب

قادری ہیں اس کتاب کی پہلی جلد کے اردو ترجمہ کا ذکر معارف میں پہلے آچکا ہے اس دوسری جلد کا اردو ترجمہ بھی سلیس اور رواں ہے ہم نے پورے ترجمہ کو تو نہیں لیکن جا بجا اس کو اصل سے ملا کر دیکھا تو زیادہ تر اصل کے مطابق پایا جو اس ہمت اور لائق مترجم کی محنت اور کاوش کی دلیل ہے امید ہے کہ اس کتاب کی تیسری جلد کا ترجمہ بھی علمی حلقہ میں پسند کیا جائیگا اُن کی اشاعت سے اردو زبان میں مفید تاریخی لٹریچر کا اضافہ ہوا ہے فارسی کی اہم کتابوں کا ترجمہ اس لئے اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ نئی نسل اس زبان سے بیگانہ ہوتی جا رہی ہے، یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ لائق مترجم آجکل نظام الدین احمد بخشی کی طبقات اکبری کے ترجمہ میں مشغول ہیں اور اسکے بعد ابو الفضل کی مشہور و ضخیم تصنیف اکبر نامہ کی تینوں جلدوں کا ترجمہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، دعا ہے کہ ان کی محنت بار آور ہو، پاکستان میں عربی فارسی کی اہم کتابوں کے ترجمے عام طور سے ہو رہے ہیں، چنانچہ ملا عبد القادر بدایونی کی منتخب التواریخ، گلبدن بیگم کی ہمایوں نامہ اور جہانگیر کی تزک جہانگیری کے ترجمے بھی کتب فروشوں کے یہاں مل سکتے ہیں، لیکن اگر ان ترجموں میں بھی کوتاہیاں سرزد ہوئیں جو حیدرآباد کے دار الترجمہ کے مترجموں سے ہو چکی ہیں، تو یہ ترجمے زیادہ مفید ثابت نہ ہو سکیں گے، دار الترجمہ کے ترجموں کی اشاعت و طباعت میں کافی سرمایہ صرف ہوا لیکن اُن کے ترجمے زیادہ تر ایسے ہیں جو اصل سے اس قدر مختلف ہو گئے ہیں کہ تنہا ان ترجموں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی کئی تاریخیں انگریزی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں، راورٹی نے طبقات ناصری، مسز اے ایس بیورج نے بابر نامہ، ہمایوں نامہ، ایچ بیورج نے اکبر نامہ، ایچ - بلاخمن نے آئین اکبری اور جارج رینکنگ نے منتخب التواریخ کے انگریزی ترجمے میں جو محنت، دیدہ ریزی اور عرق ریزی کی ہے، وہ اردو کے مترجموں کیلئے مثالی نمونے ہونے چاہئیں، ان میں بھی کہیں کہیں غلطیاں ضرور ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے وہ ستائش کے لائق ہیں، اردو کے ترجموں میں زیادہ حواشی لکھنے کا لحاظ نہیں رکھا جاتا جیسا کہ انگریز مترجم لکھتے ہیں، یہ ہمارے اردو کے مترجموں کی راحت پروری اور عجلت پسندی کی دلیل ہے، جو اس دور میں سراہی نہیں جا سکتی،

مقالات

معالم السنن امام خطابی

از ضیاء الدین اصلاحی

(۴)

حقیقت پسندی

امام خطابی شافعی المذہب تھے، لیکن اس میں غلو نہ تھا، چنانچہ بعض مسائل میں انھوں نے امام شافعیؒ سے اختلاف بھی کیا ہے، بلکہ بعض مواقع پر ان کے مقابلہ میں دوسرے ائمہ کے مذاہب کو مرجح اور احوط قرار دیا ہے، اس سے ان کی حقیقت پسندی، انصاف اور رواداری ظاہر ہوتی ہے، مثلاً

زیورات کی زکوٰۃ کے وجوب میں صحابہ میں اختلاف ہے، حضرت عمرؓ، ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ (رضی اللہ عنہم) سے وجوب مروی ہے، لیکن جابر بن عبد اللہؓ، حضرت عائشہؓ، قاسم ابن محمد، شعبہ اور ایک روایت کے بموجب حضرت ابن عمرؓ سے عدم وجوب کی روایت ہے، سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، عطاء، ابن سیرین، جابر بن زید، مجاہد، زہری، ثوری اور ابو حنیفہ رحمہم اللہ نے پہلے قول کو اور امام مالک، احمد اور اسحٰق بن راہویہ نے دوسرے قول کو مرجح قرار دیا ہے، امام شافعیؒ کا بھی یہی اظہر و اصح قول معلوم ہوتا ہے، جو لوگ وجوب کے قائل ہیں، ظاہر کتاب اور احادیث و آثار سے ان کی تائید ہوتی ہے، دوسرے مسلک کے ماننے والوں نے اصلاً نظر و قیاس

پر اعتماد کیا ہے، اور روایت سے بھی یک گونہ ان کی تائید ہوتی ہے، مگر پہلا قول زیادہ بہتر اور احوط ہے، واللہ اعلم۔[1]

ایک حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :۔

"اگر حولان حول سے ایک روز قبل بھی کسی نے اپنے اونٹوں کا دوسرے اونٹوں سے تبادلہ کر لیا تو اس کو زکوٰۃ نہیں دینی ہوگی، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی دونوں بزرگوں کا یہی مسلک ہے، مگر امام شافعی کے نزدیک مویشیوں کی طرح نقود میں بھی مبادلہ کرنے سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک نقود میں ساقط نہیں ہوگی، یہی قول احوط اور زیادہ بہتر ہے، کیونکہ نقود اصل المال ہیں، اگر ان میں اس قسم کے مبادلہ کو جائز قرار دیا گیا تو یہ فقراء کے حقوق کو روکنے اور زکوٰۃ کو باطل کرنے کا ایک ذریعہ ہو جائے گا۔"[2]

جمہور فقہاء کے نزدیک محرم کے بغیر عورت حج کا سفر نہیں کر سکتی، مگر امام مالک کے نزدیک عورتوں کی جماعت اور امام شافعیؒ کے نزدیک ایک آزاد اور ثقہ مسلمان عورت کے ساتھ اس کا سفر کرنا جائز ہے، امام خطابی امام شافعی کے قول کی ترجیح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"آزاد اور ثقہ مسلمان عورت کی حیثیت محرم آدمی کی نہیں ہے، جبکہ نبیؐ کا ارشاد ہے کہ عورت کو بلا محرم کے سفر ہی نہیں کرنا چاہیے، اس قید اور شرط سے حج کے سفر کو مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ خلاف سنت ہے، اور بغیر محرم کے عورت کا سفر کرنا معصیت ہے، اس لیے محرم کے موجود نہ ہونے کی صورت میں اس پر حج کی ادائیگی فرض و لازم نہیں ہوگی، لیکن امام شافعی اور ان کے متبعین فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ استطاعت زاد و راحلہ کا نام ہے" پس اگر زاد و راحلہ میسر ہوں تو اس پر حج لازم ہو جائے گا، رہی نہی تو اس کا تعلق ان سفروں سے ہوگا جو تطوعاً کیے جاتے ہیں، اس کا اطلاق سفر واجب پر نہیں ہوگا، لیکن یہ استدلال جس

حدیث پر مبنی ہے، اس کے راوی ابراہیم بن یزید خوزی محدثین کے نزدیک متروک الحدیث ہیں اور یہ روایت حسن کے طرق سے مرسلاً بھی مروی ہے، لیکن امام شافعی کے نزدیک مراسیل سے حجت قائم نہیں ہوتی،

شوافع کا خیال ہے کہ جس طرح کافر عورت دار الحرب میں مسلمان ہو جانے کے بعد محرم کے بغیر ہجرت کر کے دار الاسلام چلی آئے گی یا کوئی مسلمان قیدی عورت اگر کفار کے قید و بند سے رہا ہو جائے تو وہ تنہا سفر کر کے مسلمانوں کے علاقہ میں چلی آئے گی، کیونکہ ان دونوں صورتوں میں عورتوں کا بلا محرم سفر کرنا واجب ہے، اسی طرح حج کا سفر بھی چونکہ واجب ہے، اس لیے اس میں بھی وہ بلا محرم کے سفر کر سکتی ہے، لیکن یہ قیاس غلط ہے، اگر واقعۃً ان سب سفروں کی حیثیت بالکل یکساں ہے تو عورت کو تنہا حج کے سفر کی اجازت دینا چاہیے تھا، آزاد اور ثقہ مسلمان عورت کی معیت کی قید لگانے کی کیا ضرورت تھی، اس قید سے تو خود ثابت ہوتا ہے کہ حج کے سفر اور ان سب سفروں میں بالکل واضح اور بین فرق ہے۔"[1]

فَیْ کے متعلق بھی اختلاف ہے، حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہے کہ غنیمت کی طرح اس میں خُمس نہیں نکالا جائے گا، یہی جمہور ارباب فتویٰ کا مسلک ہے، مگر امام شافعی اس میں بھی خمس کے قائل ہیں، امام خطابی ان کے استدلال کی توضیح کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

"حضرت عمرؓ آیت کی مراد و منشا کو زیادہ بہتر جانتے تھے، اور عام فقہاء نے بھی انکی متابعت کی ہے، لیکن امام شافعی نے ان کے قول کی متابعت نہیں کی ہے، ظاہر ہے کہ صحابی کے قول کو اختیار کرنا ہی اولیٰ و احسن ہے، حضرت عمرؓ خلیفۂ عادل تھے، اور رسول اللہؐ نے فرمایا ہے :۔

اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر — میرے بعد ابوبکرؓ و عمرؓ کی اقتدا کرو

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اقتدا ضروری اور لازمی ہے۔"[2]

روایت پسندی گو بعض ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے امام شافعیؒ کے مسلک کو ترجیح دینے میں انصاف سے کام نہیں لیا ہے، لیکن اس کی مثالیں کم ہیں اور عموماً انھوں نے حدیث و سنت کو ہر چیز پر مقدم قرار دیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اصلاً روایت پسند تھے، مثلاً نجاشی کی غائبانہ نماز جنازہ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

"نجاشی مسلمان تھا، رسول اللہؐ پر ایمان رکھتا تھا اور آپ کی نبوت کی تصدیق کرتا تھا، مگر اپنے ایمان کو چھپاتا تھا، اور چونکہ مسلمانوں پر دوسرے مسلمانوں کے لیے دعا کرنا اور جنازہ کی نماز پڑھنا واجب ہے، لیکن نجاشی کفار کے درمیان تھا، اور مسلمانوں کو اس کی نماز جنازہ کا موقع نہیں ملا، اس لیے رسول اللہؐ نے نماز جنازہ غائبانہ پڑھی، کیونکہ آپ نبی و ولی ہونے کی حیثیت سے اس کے زیادہ حقدار تھے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی جگہ فوت ہو جائے اور اس کی نماز جنازہ وہاں پڑھی جا چکی ہو تو دوسری جگہ کے لوگوں کو اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کی ضرورت نہیں لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کسی عائق و مانع یا کسی خاص عذر کی وجہ سے کسی مسلمان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی ہے تو اس کی نماز جنازہ ادا کرنا مسنون ہے، بُعدِ مسافت کی وجہ سے اسکو ترک نہیں کیا جا سکتا، نماز ادا کرتے وقت میت کے شہر کے بجائے قبلہ کی طرف رخ کیا جائے گا،

بعض علماء نے غائبانہ نماز جنازہ کو مکروہ قرار دیا ہے، ان لوگوں کے نزدیک آپ کا یہ عمل آپ کی ذات کے لیے مخصوص تھا، جیسا کہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نجاشی کا مشاہدہ فرما رہے تھے، مگر یہ توجیہ درست نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہؐ جب شریعت کا کوئی کام انجام دیں تو مسلمانوں پر اس کی متابعت لازم ہے، اور اس کو بلا دلیل تخصیص پر محمول نہیں کرنا چاہیے، یہاں تخصیص کی دلیل نہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ آپ صحابۂ کرام کو اپنے ہمراہ لیکر نماز جنازہ ادا کرنے گئے تھے، اور سب لوگوں نے آپ کے ساتھ جنازہ کی نماز ادا کی تھی،[1]

---

[1] معالم السنن ج ۱ ص ۳۱۱

عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص کے پاس چھ غلام تھے، ان کے علاوہ اور کوئی سامان اس کی ملکیت میں نہ تھا، اس نے اپنی موت کے وقت ان کو آزاد کر دیا، رسول اللہؐ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ناپسندیدگی ظاہر فرمائی، پھر ان غلاموں کے درمیان قرعہ اندازی کر کے ایک ثلث یعنی دو غلاموں کو آزاد کر دیا، اور چار کو غلام برقرار رکھا، فقہاء کی ایک جماعت امام مالک، شافعی، احمد اور اسحق بن راہویہ وغیرہ کا فتوی اس حدیث کے بالکل ظاہر کے مطابق ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ ہر غلام کے تین حصے کیے جائیں گے، ایک حصہ آزاد اور دو حصے غلام متصور کیے جائیں گے اور وہ ان دو حصوں کی آزادی کے لیے سعی کریں گے، صرف دو غلاموں کو آزاد کرنا اور چار کو غلام برقرار رکھنا درحقیقت ظلم اور ناانصافی ہے، کیونکہ مالک کا مقصد سب کو آزاد کرنا تھا مگر سب کو آزاد کر کے اس نے ایک ممنوع کام کیا ہے، اور اپنے ورثاء کے حق کو پامال کیا ہے، اس لیے اس کا جس قدر عمل جائز اور صحیح ہے اس میں سارے غلاموں کو شریک کرنا لازم ہے، جس طرح کہ ہبہ اور وصیت جز میں صحیح ہے، اسی طرح عتق بھی صحیح ہوگا، لیکن جب صاحبِ شریعت کا کوئی فیصلہ اور فرمان موجود ہو تو اس پر رائے و قیاس سے اعتراض کرنا یا اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے اصل کو لانا صحیح نہیں ہے، بلکہ اسی کو اصل قرار دینا اور اصلی حالت پر باقی رکھنا لازم ہے، وصیت اور ہبہ کی حیثیت عتق سے جدا اور مختلف ہے، کیونکہ ورثاء کو مشترک اور عام ہبہ و وصیت سے نقصان نہیں پہنچتا، لیکن اگر عتق عام و مشترک ہو تو انھیں نقصان پہنچتا ہے، پھر عتق کا مسئلہ سب کو اسی وقت شامل ہو سکتا ہے جب اس کی گنجایش ہوتی، لیکن یہاں تو خود دین کے حکم اور رسول کے عمل نے سارے غلاموں میں اس کے اجزاء کے جاری کرنے کو ممنوع کر دیا ہے، اسی لیے قرعہ اندازی کی جائے گی تاکہ ظلم و ناانصافی کا احتمال باقی نہ رہے۔ (ج ۴ ص ۷۷)

امام خطابیؒ کی اس رائے سے اختلاف کیا سکتا ہے، لیکن درحقیقت اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک حدیث و سنت کو کس قدر اہمیت حاصل تھی، اور وہ روایت حدیث کو ہر چیز سے مقدم خیال کرتے تھے، اکثر مسائل و مباحث کے اختتام پر ان کے اس قسم کے الفاظ ملتے ہیں۔

السنة احق واولی ان یتبع — سنت کی اتباع کرنا زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے

حدیثوں میں تطبیق اور رفع تضاد امام خطابیؒ نے حدیثوں کے اختلاف و تضاد کو رفع کرنے اور ان میں تطبیق دینے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں، ایک صورت یہ ہے کہ دو حدیثیں متضاد و متعارض ہوں لیکن ان میں ایک کی سندیں قوی اور دوسرے کی ضعیف ہوں، ظاہر ہے کہ اس صورت میں قوی الاسناد حدیثوں کو مقدم قرار دیا جائے گا، مثلاً حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے بابل کی سرزمین کو ملعون قرار دیا اور اس میں مجھے نماز پڑھنے سے منع کیا، لیکن اس کی سندوں میں کلام ہے، اسی لیے کسی صاحب علم نے بابل میں نماز پڑھنے کو حرام نہیں قرار دیا ہے، کیونکہ اس کے برخلاف رسول اللہ کی یہ مشہور حدیث جو زیادہ صحیح اور قوی ہے، موجود ہے:۔

جعلت لی الارض مسجداً وطھوراً — ساری زمین میرے لیے مسجد اور پاک بنائی گئی ہے

اگر پہلی روایت کو صحیح و ثابت مانا جائے تو اس کا یہ مفہوم ہوگا کہ آپ نے بابل میں سکونت اختیار کرنے اور اس کو وطن بنانے سے منع فرمایا ہے، اس حیثیت سے وہاں نماز پڑھنے کی ممانعت بھی ہو جائیگی، لیکن یہ نہی خصوص پر محمول کیجائے گی، جیسا کہ حضرت علیؓ کے لفظ "نہانی" (مجھے منع کیا) سے یہ تصریحاً ظاہر ہوتا ہے، دوسرا احتمال یہ ہے کہ ممکن ہے رسول اللہؐ کا مقصد حضرت علیؓ کو اس فتنہ سے خبردار کرنا رہا ہو جو آئندہ ان کو کوفہ میں پیش آنے والا تھا۔" (ج ا ص ۱۴۸)

بعض حدیثیں ناسخ اور بعض منسوخ ہوتی ہیں، چونکہ عام لوگوں کی اس پر نظر نہیں ہوتی اسلیے وہ ان کو متعارض سمجھتے ہیں، اس کی بیشمار مثالیں ہیں، ان کو طوالت کے خوف سے قلم انداز کیا جاتا ہے

لیکن امام خطابی نے احادیث کو نسخ پر محمول کرنے سے حتی الامکان پرہیز کیا ہے اور ان میں بھی تطبیق کی پوری کوشش کی ہے، مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کے پاس چلا گیا، پھر اس نے رسول اللہؐ سے آکر بیان کیا۔ آپ نے اس کو کفارہ کی حسب ذیل تین صورتیں بتائیں: (۱) ایک غلام آزاد کرنا، (۲) دو ماہ کے پےدرپے روزے رکھنا۔ (۳) ساٹھ ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔ اس نے کہا مجھے ان میں سے کسی کی تعمیل کی وسعت و قدرت نہیں، اسی اثنا میں آپ کے پاس ایک زنبیل کھجوریں آئیں، آپ نے فرمایا کہ لو اسے صدقہ کر دینا، اس نے کہا اے اللہ کے رسول! مجھ سے زیادہ محتاج کون شخص ہوگا، اس پر آپ ہنس پڑے اور فرمایا اچھا تمھیں لے لو، اپنے اہل و عیال کو کھلا دینا۔" اس حدیث کو بعض لوگوں نے منسوخ قرار دیا ہے، مگر امام خطابی حدیث کا صحیح مفہوم بیان کرنے کے بعد اس کی تردید کرتے ہیں۔

"ان لوگوں کے قول کی صحت کا کوئی ثبوت حدیث سے نہیں ملتا، کیونکہ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ عدم وسعت کی وجہ سے اس وقت اس شخص کے ذمہ سے کفارہ ساقط ہو گیا تھا لیکن سرے سے اس کے ساقط ہونے کا اس میں کوئی ثبوت نہیں ہے، بلکہ آئندہ وسعت ہونے کے بعد وہ اس کے ذمہ لازمی ہوگا۔ گویا اس کا معاملہ اس مفلس جیسا ہوگا جس کو قرض ادا کرنے کے لیے موقع اور مہلت دیجاتی ہے، اس لیے حدیث کے منسوخ ہونے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔" (ج ۲ ص ۱۱۹)

اگر کسی حدیث کی دلالت مختلف معانی پر ہوتی ہو تو امام خطابی ان سب معنوں پر اس کو محمول کرتے ہیں، مثلاً

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مردہ کو اس کے اہل و عیال کے رونے دھونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے، حضرت عائشہؓ نے جب یہ سنا تو فرمایا کہ اللہ ابن عمرؓ پر رحم فرمائے۔ ان کو وہم ہو گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ آپ ایک یہودی کی قبر کے پاس سے

گذرے تو فرمایا کہ اس کو عذاب دیا جا رہا ہے، درآنحالیکہ اس کے متعلقین اس پر رو رہے ہیں، پھر یہ آیت پڑھی:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی (بنی اسرائیل) — اور کسی پر نہیں پڑتا بوجھ دوسرے کا۔

حضرت عائشہؓ نے جو مفہوم بیان کیا ہے وہ عین ممکن ہے کیونکہ انھوں نے یہ وضاحت کی ہے کہ یہ ایک یہودی کا واقعہ تھا، اس حیثیت سے ان کی روایت مفسر ہے اور مفسر یا حدیثیں مجمل حدیثوں کے مقابلہ میں اولیٰ اور مرجح ہوتی ہیں، نیز ان کا استدلال آیت پر بھی مبنی ہے، تاہم حضرت ابن عمرؓ کا مفہوم بھی صحیح ہو سکتا ہے اور وہ آیت کے خلاف بھی نہیں ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اہل عرب اپنے ورثا کو نوحہ و بکا کی وصیت اور تلقین کرتے تھے، اس کا ذکر ان کے اشعار میں بھی ملتا ہے، طرفہ کہتا ہے:

اذا مت فانعيني بما انا اهله — وشقي على الجيب يا ام معبد

(ترجمہ) جب میں مر جاؤں تو اے ام معبد اپنے گریبان چاک کرنا اور میرے شایان شان میرا ماتم کرنا

لبید بن ربیعہ کا شعر ہے:

الى الحول ثم اسم السلام عليكما — ومن يبك حولا كاملا فقد اعتذ

(ترجمہ) تم دونوں (میری قبر پر) سال بھر تک رونا اور مجلس ماتم بپا کرنا (اس کے بعد اپنے فرض سے بری الذمہ اور سبکدوش ہو جاؤ گے کیونکہ) جو شخص (میت پر) سال بھر تک رو دھو لے وہ قابل معافی ہے۔

اس اعتبار سے میت کو اس وصیت اور تلقین کی پاداش میں عذاب دیا جائے گا، جو اس نے اپنی زندگی میں اپنے ورثا کو کی تھی، رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے:

ومن سن سنة سيئة فعليه وزرها ووزر من عمل بها — اور جس نے کوئی برا طریقہ ایجاد کیا اور اس پر اسکا اور ان لوگوں کا بھی جو اس برے طریقہ کو اختیار کریں گے عذاب دیا جائے گا،

(ج ا ص ۲۰۲ و ۲۰۳)

اسی طرح اگر بعض حدیثوں کی دلالت مختلف معانی پر ہوتی ہے تو وہ اس مفہوم کو اختیار کرتے ہیں، جو دوسری صحیح و ثابت روایتوں کے موافق ہوتا ہے،

بعض حدیثوں میں اس لیے تضاد معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص موقع و محل یا مخصوص شخص کے حالات کے لحاظ سے ہوتی ہیں، چونکہ ان حالات و ظروف پر نگاہ نہیں ہوتی اس لیے قلت تدبر اور عدم فکر کی وجہ سے ان پر اعتراض کیا جاتا ہے، مثلاً

حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک شخص انڈے کے برابر سونے کا ایک ڈلا لایا اور کہا کہ یہ مجھے ایک کان سے ملا ہے، میرے پاس اسکے سوا اور کچھ نہیں ہے، آپ اس کو قبول فرمائیں، یہ میری طرف سے صدقہ ہے، رسول اللہ صلعم نے کئی بار انکار فرمایا، مگر جب اس نے مسلسل اصرار کیا تو آپ نے سونا لے لیا اور فرمایا کہ تم لوگ اپنی ساری پونجی صدقہ کر دیتے ہو اور اس کے بعد محتاج اور دست نگر بن جاتے ہو، بہترین صدقہ وہ ہے جس کے بعد آدمی محتاج اور دست نگر نہ رہے، اسی مفہوم کی ایک اور حدیث ہے کہ رسول اللہ صلعم نے حضرت سعدؓ سے فرمایا کہ تمھارا اپنے ورثہ کو غنی اور خوشحال چھوڑنا ان کو محتاج اور دست نگر چھوڑنے سے بہتر ہے۔ بظاہر اس شخص کے ساتھ جس نے آپ کو سونا دیا تھا، آپ نے جو طرز عمل اختیار کیا تھا، وہ آپ کے اس طرز عمل سے مختلف معلوم ہوتا ہے جو آپ نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ اختیار کیا تھا، کیونکہ آپ نے ان کا سارا مال و اسباب بخوشی قبول کر لیا تھا اور اس پر کسی قسم کی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں فرمایا تھا، لیکن یہ درحقیقت اسی بنا پر کہ آپ کو حضرت ابوبکرؓ کی نیت کی صحت اور قوت یقین کا پورا اندازہ تھا، اس لیے آپ کو ان کے بارہ میں کسی طرح کے فتنہ کا اندیشہ نہیں تھا، اس کے برعکس اس شخص کے بارہ میں آپ کو خطرہ تھا کہ اگر وہ اپنا سب کچھ صدقہ کر دیتا ہے تو اس کے بعد ممکن ہے سخت کشمکش اور الجھن میں پڑ جائے، نیز اگر سارا مال دینے کی وجہ سے اس کو افسوس اور ندامت دامنگیر

ہوئی تو اس کا سارا اجر باطل ہو جائے گا۔"

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کھانا موجود ہو اور نماز کھڑی ہو جائے تو کھانے سے پہلے نہیں اٹھنا چاہیے، اس کے برخلاف حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے یا کسی اور چیز کے لیے نماز کو مؤخر نہیں کرتے تھے،

ان دونوں حدیثوں میں جمع وتطبیق کی صورت یہ ہے کہ پہلی حدیث کا تعلق اس شخص سے ہے جس کو سخت بھوک لگی ہو اور کھانا چھوڑنے سے اس کے کشمکش اور نماز کے اندر خلل اور وسوسہ ہو جانے کا اندیشہ ہو تو کھانا آجانے کے بعد اگر نماز کے وقت میں گنجایش ہو تو پہلے کھا لینا چاہیے تاکہ اس کا نفس مطمئن ہو جائے، اور کھانے کی خواہش ورغبت ختم ہو جائے اور وہ اطمینان سے نماز ادا کر سکے، عہد صحابہ میں یہ آسان تھا کیونکہ ان کے یہاں کھانے کی بہت سی قسمیں نہیں ہوتی تھیں اور ان کا دسترخوان تکلفات وتنوعات سے خالی ہوتا تھا، اس لیے وہ بہت جلد کھانے پینے سے فارغ ہو جاتے تھے، اس کی وجہ سے نماز میں کوئی تاخیر نہیں ہوتی تھی، حضرت جابرؓ کی حدیث کی نوعیت اس سے مختلف ہے، یہ اس شخص کے متعلق ہے جس کو: سخت بھوک لگی ہو اور نہ ابھی کھانا آیا ہو، اور نماز کا وقت بھی ہو گیا ہو تو اس کو پہلے نماز اور بعد میں کھانا کھانا چاہیے۔" (ج ۴ ص ۲۴۱ و ۲۴۲)

حدیث کے رد وانکار کی ایک دلیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثیں لکھنے سے منع فرمایا تھا، اس کی حقیقت ملاحظہ ہو:۔

"عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں کہ میری عادت تھی کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتا تھا، اس کو لکھ لیتا تھا، تاکہ اچھی طرح محفوظ ہو جائے، مگر قریش نے مجھے اس سے منع کر دیا، اور کہا کہ رسول اللہؐ بھی انسان ہیں، آپ بعض اوقات غیظ وغضب کی حالت میں بھی کلام فرماتے ہیں، اس لیے آپ کی ہر بات

نہ لکھا کرو، اس لیے میں نے لکھنا چھوڑ دیا، مگر جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کو بیان کیا تو آپ نے اپنی انگلی سے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لکھ لیا کرو، قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، اس سے صرف حق بات ہی نکلتی ہے، دوسری روایت مطلب بن خطب سے ہے کہ حضرت زیدؓ بن ثابت نے حضرت معاویہؓ سے ایک حدیث بیان کی تو انھوں نے ایک آدمی کو اسکے لکھنے کا حکم دیا، حضرت زیدؓ نے فرمایا کہ رسول کریمؐ نے ہم کو حدیثیں لکھنے سے منع کیا ہے، چنانچہ حضرت معاویہؓ نے بھی اسے مٹا دیا،

اس اختلاف وتضاد کو رفع کرتے ہوئے امام خطابی فرماتے ہیں:۔

"ممکن ہے پہلے تحریر وکتابت کی ممانعت کا حکم رہا ہو، لیکن بعد میں آپ نے اسکو جائز ومباح ٹھہرایا ہو، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے ایک ہی مجموعہ میں حدیث وقرآن دونوں کے لکھنے سے منع کیا تھا، کیونکہ اس سے دونوں میں اشتباہ اور گڈمڈ ہو جانے کا اندیشہ تھا، باقی مجرد لکھنا اور علم کو قلمبند کرنا ممنوع نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود امت کو تبلیغ ودعوت کا حکم دیا ہے، چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے فرمایا فلیبلغ الشاهد الغائب (موجود لوگ غیر حاضر لوگوں کو بتا دیں) ظاہر ہے آپ کے ارشادات کی تبلیغ اُن کو قلمبند کیے بغیر کس طرح ممکن تھی، اس کے بغیر امت کے آخری دور کے لوگوں کو حدیثوں سے واقفیت کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا، پھر نہ لکھنے سے علم کے ضائع ہونے کا بھی اندیشہ ہے کیونکہ نسیان تو بشریت کا اقتضا ہے، اور کس کا حافظہ غلطی سے مامون رہ سکتا ہے، اسی لیے ایک شخص سے جس نے آپ سے سوء حفظ کی شکایت کی تھی، آپؐ نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے مدد لو اور اپنے ایک خطبہ کے متعلق فرمایا کہ اسے ابوشاہ کے لیے لکھ دو چنانچہ وہ لکھا گیا، اس کے علاوہ رسول اللہؐ نے صدقات ودیات کے احکام وفرامین لکھوائے تھے یا وہ آپ سے سنکر لکھے گئے، ان تمام باتوں سے حدیثیں لکھنے اور علم کو قلمبند کرنے کا ثبوت ملتا ہے" (ج ۴ ص ۱۸۴ و ۱۸۵)

تفسیری مباحث | معالم السنن میں قرآنی آیات کی تفسیر و تاویل بھی نہایت لطیف اور دلکش انداز میں کی گئی
ہے، اس کی بعض مثالیں گذشتہ مباحث میں گذر چکی ہیں اور آیندہ بھی ضمناً ذکر کیجائیں گی، اس لیے ان کو
قلم انداز کیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ حدیث کی توضیح قرآن سے اور قرآن کی حدیث
سے کرتے ہیں، مثلاً

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "اپنی بیویوں کو اپنی لونڈیوں کی طرح نہ مارو" امام خطابی
فرماتے ہیں کہ اس سے مطلقاً بیویوں کو نہ مارنا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ ضرورت کے وقت عورتوں کو مارا جاسکتا
ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی رخصت عطا کی ہے، چنانچہ فرمایا :

فعظوھن واھجروھن فی المضاجع   تو ان کو سمجھاؤ اور جدا کرو سونے میں

واضربوھن (نساء - ٦)   اور مارو !

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مذکورہ بالا حدیث میں ضرب شدید کی ممانعت کی گئی ہے۔ (ج ا ص ۹۸)

اس مثال سے حدیث و قرآن میں تعارض کی نفی ہوتی ہے، اسی طرح اگر کسی مسئلہ کے متعلق متعدد
روایات موجود ہوں تو ان میں اس حدیث کو اختیار کرنا چاہیے جو ظاہر قرآن کے موافق ہو، اس کی مثال
صلوٰۃ الخوف سے متعلق روایات میں ملتی ہے، ایک اور روایت میں ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم لوگ جھوٹ سے بچو، کیونکہ جھوٹ فجور کی اور فجور دوزخ
کی جانب لیجاتا ہے، اور سچائی اختیار کرو، کیونکہ سچائی نیکی کی طرف اور نیکی جنت کی طرف لے جانے والی ہے،
ٹھیک یہی چیز قرآن کی اس آیت میں بیان کی گئی ہے :-

ان الابرار لفی نعیم وان الفجار   بیشک نیک لوگ بہشت میں ہیں اور

لفی جحیم (انفطار) (معالم السنن ج ۴ ص ۱۳۳)   بیشک گنہگار دوزخ میں ہیں۔

حدیث کی فنی بحثیں | امام خطابی جرح و تعدیل کے بھی امام تھے، اور معالم السنن میں اصول حدیث کے متعلق

بڑی ماہرانہ گفتگو کی ہے، یہاں اس کے بعض نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔
محدثین کا ایک اصول یہ ہے کہ ثقہ راوی کی زیادتی مقبول اور صحیح روایت کا اضافہ معتبر ہوتا ہے
ان کا ایک دوسرا اصول یہ ہے کہ اگر کسی روایت میں کسی مسئلہ کا اثبات ہو تو وہ اس روایت کے مقابلہ
میں مرجح ہوگی جس میں نفی کا ذکر ہو، ان میں سے ایک اصول کا مندرجۂ ذیل مثال میں ذکر ہے :
" رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کے ثبوت میں جو صحیح حدیثیں ہیں وہ
ابن مسعودؓ کی حدیث کے مقابلہ میں جس میں اس کی نفی کا ذکر ہے، اولیٰ ہیں، کیونکہ اثبات نفی پر مقدم ہوتا ہے
ممکن ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس بارہ میں ویسے ہی سہو ہوگیا ہو جیسے کہ گھٹنوں کو رکوع میں پکڑنے
کے متعلق ان سے تسامح ہوگیا ہے، اور تمام صحابہ نے ان سے اختلاف کیا ہے، اسی طرح کعبہ کے اندر رسول اللہ صلعم
کے نماز پڑھنے کے متعلق اختلاف ہے، حضرت بلالؓ سے اثبات کی اور حضرت اسامہؓ سے نفی کی روایت ہے،
مگر لوگوں نے حضرت بلالؓ کے قول کو اختیار کیا ہے، اور حضرت اسامہؓ کی روایت کو ان کے سہو پر
محمول کیا ہے،

اسی طرح محدثین کے اس اصول کا بھی کئی جگہ ذکر کیا ہے کہ مفسر حدیثیں مجمل حدیثوں کے مقابلہ
میں مقدم قرار دی جائیں گی، اور ثقہ کا اضافہ اور معتبر حدیث کی زیادتی مقبول ہوگی۔

ایک حدیث کی سند کے سلسلہ میں ائمۂ فن اور علمائے جرح و تعدیل کے اقوال نقل کیے
ہیں، اس کی تفصیل یہ ہے :-

شعبہ نے یعلیٰ بن عطاء سے اور وہ علی بن عبداللہ بارقی سے اور وہ ابن عمرؓ سے اور عبداللہ بن عمرؓ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ (صلوٰۃ اللیل والنھار مثنیٰ مثنیٰ) یعنی رات اور
دن کی نماز دو دو رکعت ہے، حالانکہ ابن عمرؓ سے نافع، طاؤس اور عبداللہ بن دینار نے بھی روایت
کی ہے، اگر کسی نے بھی دن کا ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ سب نے صرف رات ہی کا ذکر کیا ہے، لیکن اضافہ

مقبول ہوتا ہے، اس لیے اہل علم نے نوافل کے سلسلہ میں اسی حدیث پر عمل کیا ہے، شعبہ نے ایک اور روایت کی ہے، اس میں مطلب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بیان کیا ہے کہ (الصلوٰۃ مثنیٰ مثنیٰ) یعنی نماز دو دو رکعت ہے، مگر محدثین نے اس حدیث کے سلسلہ میں شعبہ کو مخطی قرار دیا ہے، امام بخاری فرماتے ہیں کہ انھوں نے اس میں کئی غلطیاں کی ہیں، عن انس بن ابی انس کہا ہے، حالانکہ صحیح عمران بن ابی انس ہے، پھر عن عبداللہ بن حارث کہا ہے، جو عن عبداللہ بن نافع عن ربیعہ بن الحارث ہے اور ربیعہ ابن حارث، مطلب کے بیٹے ہیں، اس کے علاوہ وہ عن المطلب کہتے ہیں جبکہ حدیث فضل بن عباس کے واسطہ سے مروی ہے اور شعبہ نے فضل کا ذکر ہی نہیں کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ اس کو لیث بن سعد نے عبداللہ بن سعید سے اور انھوں نے عمران بن انس سے اور انھوں نے عبداللہ بن نافع سے اور وہ ربیعہ بن حارثؓ سے اور وہ فضل بن عباس سے اور فضل رسول اللہ صلعم سے بیان کرتے ہیں اور یہی صحیح ہے، یعقوب بن سفیان نے بھی امام بخاری کی طرح شعبہ کو مخطی قرار دیا ہے، اور لیث بن سعد کی تصویب کی ہے، یہی محمد بن اسحٰق بن خزیمہ کا بھی خیال ہے" (ج ۱ ص ۷۱، ۷۲)

فقہا کے مسالک امام ابوسلیمان خطابی فقہ و خلاف میں بھی ممتاز تھے، ان کی اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فقہاء کے آراء و مسالک اور مختلف مسائل و احکام میں علماء کے اختلافات کی پوری تفصیل موجود ہے، اس کی متعدد مثالیں دوسری بحثوں میں ضمناً گذر چکی ہیں، ذیل میں ان بزرگوں کے نام تحریر کیے جاتے ہیں، جن کے مسالک امام خطابی نے تحریر فرمائے ہیں:

صحابہ کرام میں حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، سعدؓ بن وقاص، عائشہؓ، عبداللہؓ بن مسعود، زیدؓ بن ثابت، ابوسعید خدریؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، انسؓ بن مالک، عبداللہ بن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابن زبیرؓ، ابوہریرہؓ، جابرؓ، عبداللہ بن مغفلؓ وغیرہ، تابعین و تبع تابعین میں عمرؒ بن عبدالعزیزؒ، سعید بن مسیب، سعید بن جبیرؒ، عروہ ابن زبیرؒ، زہری، عطا بن ابی رباح، سلیمان بن یسار، عمرو بن دینار، سالم، قاسم بن محمد، قاضی شریح، قتادہ، طاؤس، مکحول، مسروق، ابن جریج، مجاہد، ابن سیرین، حسن بصری، علقمہ، حماد،

ابراہیم نخعی، شعبی، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، حارث بن ہشام، ربیعہ بن عبدالرحمٰن، اور عبید بن عمیر وغیرہ، اور محدثین و فقہائے امصار میں امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد، اسحٰق بن راہویہ، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، ابن شبرمہ، اوزاعی، لیث بن سعد، عبداللہ بن مبارک، ابویوسف، محمد، یحییٰ بن قطان، محمد بن اسحٰق بن خزیمہ، ابوثور، داؤد ظاہری، ابوعبید قاسم بن سلام، عبیدہ، ابن جریر طبری، ابوالعباس بن سریج، ابوسعید اصطخری، مزنی، ابوعبدالرحمٰن شافعی، ماجشون اور حکم وغیرہ،

امام خطابی نے ان حضرات کے مسالک و آراء بیان کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ انکے اختلافات میں محاکمہ بھی کیا ہے اور مرجح قول کی نشاندہی بھی کی ہے،

تفقہ و اجتہاد اس کتاب میں امام خطابی کے فقہی و اجتہادی کمالات کے نمونے بھی ملتے ہیں، قیاس و اجتہاد کی ضرورت ملاحظہ ہو

ایک حدیث میں ہے انما النساء شقائق الرجال یعنی عورتیں مردوں کی شقیق اور نصف ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز کو اس کی نظیر اور مماثل چیزوں سے ملحق کرنا جائز ہے، اسی کا نام قیاس ہے، نیز اگر خطاب مردوں سے ہو تو عورتیں بھی اس میں شامل ہیں، تا آنکہ تخصیص کی کوئی دلیل موجود ہو۔[1]

حضرت عمرؓ نے روزہ کی حالت میں بوسہ لیا پھر رسول اللہ صلعم سے اس کا تذکرہ کیا، آپ نے فرمایا اگر تم کلی کرتے تو کیا ہوتا، یعنی جس طرح کلی کرنے میں پانی کے حلق کے نیچے چلے جانے کا اندیشہ ہے جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اسی طرح اس میں بھی خطرہ ہے، لیکن جب کلی سے روزہ نہیں ٹوٹتا تو اس سے بھی نہیں ٹوٹے گا، اس سے ایک چیز کا اسی طرح کی دوسری چیز پر قیاس و اعتبار کرنا اور ایک کے حکم میں دوسری مشابہ چیز کے حکم کو بھی شامل اور شریک کرنا ثابت ہوتا ہے (ج ۲ ص ۱۱۴)

فقہی و اجتہادی بصیرت کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:-

---

[1] ج ۱ ص ۹۱

حدیث میں ہے کہ "اگر کتا برتن میں منہ ڈال دے تو اس کو سات بار دھونا اور پہلی دفعہ مٹی
سے مانجنا چاہیے"۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اشنان (یہ ایک طرح کی گھاس ہے جس کی
پتیوں سے صابن کی طرح کپڑے دھوئے جاتے ہیں) اور اسی طرح کی ان تمام چیزوں کو بھی جو
صاف ستھرا اور جلا پیدا کرنے والی ہوں استعمال کیا جاسکتا ہے، یعنی اگر مٹی کے بجائے اشن
برتن مانجا جائے تو کوئی حرج نہیں۔" (ج ۱ ص ۴۰)

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خون آلودہ کپڑے کو نمک
حل کرکے اس سے کپڑا صاف کرنے کا حکم دیا۔" امام خطابی فرماتے ہیں کہ نمک کھائی جانے والی
چیزوں میں ہے، اور جب رسول اللہؐ نے کپڑا دھونے اور خون صاف کرنے کے لیے اس کے
استعمال کا حکم دیا ہے اور صابون سے ریشمی کپڑا دھونے میں اس کے خراب ہوجانے کا اندیشہ
ہے، اس لیے شہد سے کپڑا دھونا بھی جائز ہوگا، اور داغ دھبا اور روشنائی کا نشان زائل
کرنے کے لیے سرکہ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، علی ہذا القیاس لوبیا، کدو، اور خربوزے کے
آٹے اور بھوسا سے ہاتھوں کو دھونا اور رگڑنا بھی درست ہے، غرض جن چیزوں سے صفائی
اور جلا ہوسکتی ہو، ان کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" (ج ۱ ص ۹۶)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہؐ اور صحابۂ کرام پہلے بیت المقدس کی جانب
رخ کرکے نماز پڑھتے تھے، مگر جب یہ آیت اتری کہ (فول وجھک شطر المسجد الحرام) تو
خانہ کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے لگے، اس کے بعد قبیلہ بنو سلمہ کے ایک شخص نے کچھ لوگوں
کو دیکھا کہ وہ بیت المقدس کی جانب رخ کرکے فجر کی نماز پڑھ رہے ہیں، تو اس نے دوبار زور
سے کہا کہ قبلہ تبدیل ہوگیا ہے، یہ سنکر ان لوگوں نے رکوع کے اندر ہی اپنا رخ خانہ کعبہ کی طرف
کرلیا۔" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتک جو نمازیں بیت المقدس کی جانب رخ کرکے پڑھی گئی تھیں

وہ سب ادا ہوگئیں، یہانتک کہ اگر نماز شروع کرنے سے پہلے بھی کسی کو اس کا علم نہ رہا ہو اور نماز کے
اندر علم ہوجائے تو وہ اپنی ہیئت تبدیل کرلے گا اور اس وقت تک جتنی رکعتیں پڑھ چکا ہے وہ ادا
ہوجائیں گی، اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ امام خطابی اس پر قیاس کرکے فرماتے ہیں کہ
"عبادات کی طرح معاملات میں بھی یہ صورت ہوسکتی ہے، مثلاً کسی نے کسی کو بیع وشراء کا وکیل
بنایا، پھر چند روز بعد اس کو الگ کردیا تو وکیل نے معزولی کی اطلاع سے پہلے جتنے عقود ومعاملات
کیے ہیں وہ سب درست سمجھے جائیں گے۔" (ج ۱ ص ۱۷۱ و ۲۴۲)

صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو جو قبیلۂ بنو خزاعہ کا تھا
کو بھیجا کہ وہ قریش کے بارہ میں آپ کو اطلاعات بہم پہنچائے۔ امام خطابی فرماتے ہیں کہ جب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر ہونے کے باوجود اس آدمی کو جاسوس بنایا اور اس کی باتوں کی تصدیق
بھی فرمائی تو امراض کی تشخیص اور علاج کے لیے کافر حکماء و اطباء پر اعتماد کرنا اور ان کے مشورے
ماننا بھی درست ہے، بشرطیکہ وہ اپنے فن میں بدنام اور متہم نہ ہوں۔" (ج ۱ ص ۳۲۶)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے ایک طویل حدیث مروی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "بعض صحابۂ کرام نے
ایک مریض کو سورۂ فاتحہ پڑھکر دم کیا، وہ شفایاب ہوگیا، صحابہ نے اس سے علاج کا معاوضہ لیا۔" اس
حدیث سے فقہاء نے تعلیم قرآن کی اجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے، مگر امام خطابی کے مجتہدانہ ذوق نے
اس سے اطباء اور ڈاکٹروں کے فیس لینے کا جواز بھی ثابت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں
صورتوں میں بالکل یکسانیت ہے، اس لیے ان کے احکام بھی یکساں ہوں گے۔ (ج ۳ ص ۱۰۱)
ایک شخص اجرت لیکر وزن کرتا تھا، رسول اللہ صلعم نے فرمایا "وزن کرو اور اس میں ذرا بڑھا دیا کرو۔"
امام خطابی فرماتے ہیں کہ جس طرح ناپنے اور تولنے کی اجرت لیجاسکتی ہے، اسی طرح تقسیم کرنے
اور حساب کتاب کرنے کی بھی لیجاسکتی ہے۔ (ج ۳ ص ۶۰)

آپ نے روزہ دار کو استنشاق سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس سے دماغ تک پانی پہنچنے کا اندیشہ ہے، اس پر قیاس کر کے ہر وہ چیز روزہ دار کے لیے ممنوع ہوگی جس کے جوف تک پہنچنے کا اندیشہ ہو مثلاً ایما وغیرہ۔ (ج ۲ ص ۱۰۸)

لغت و عربیت

امام خطابی ادب، انشا پردازی اور شعر و سخن میں بھی یگانہ تھے، عربی زبان و ادب پر ان کی نظر نہایت وسیع اور گہری تھی، اس لیے معالم السنن ادبی و لغوی حیثیت سے بھی معلومات افزا کتاب ہے، اگر اس کی لغوی، ادبی اور نحوی تحقیقات کو جمع کیا جائے تو ایک رسالہ مرتب ہو سکتا ہے، خطابی نے الفاظ کی تحقیق میں اعراب، اوزان، اشتقاق، تذکیر و تانیث، واحد، تثنیہ اور جمع کی تصریح، مختلف قبائل کی زبانوں کے اختلاف اور مترادف الفاظ کے دقیق معنوی فرق کی توضیح، موقع و محل کی رعایت سے معنی کی تعیین، شرعی و اصطلاحی الفاظ کی تشریح، الفاظ کی اپنے معنی سے حقیقی یا نسبی مناسبت، مشکل جملوں، محاوروں، ضرب الامثال، طرز ادا اور اسالیب کلام کی وضاحت، نحوی و صرفی مباحث اور معانی و بیان کے نکات، غرض مختلف پہلوؤں سے جامع اور محققانہ بحثیں کی ہیں، اور قرآن مجید، احادیث اور شعرائے عرب کے کلام سے شواہد و نظائر پیش کیے ہیں، ان سب خصوصیات کی تفصیل دکھانا بہت دشوار ہے، اسلیے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے:

مترادف الفاظ کا فرق

عربی نہایت وسیع زبان ہے، اس کے ذخیرۂ لغت میں معمولی فرق کے لیے جدا جدا الفاظ پائے جاتے ہیں، اس کا اندازہ مترادف لفظوں کے ان معنوی فرق سے ظاہر ہے،

"ظن" کی ابتدا حسبان (گمان) اور آخر علم و یقین ہے، اسی لیے عرب کبھی ظن کو حسبان اور کبھی علم و یقین کے موقع پر استعمال کرتے ہیں، کیونکہ اس کے کنارے دونوں لفظوں سے ملے ہوئے ہیں، علم کا آغاز بھی ظن سے اور خاتمہ یقین پر ہوتا ہے، قرآن مجید میں ہے (الّذین یظنون انھم ملاقوا ربھم) یہاں یظنون، یوقنون کے معنی میں ہے۔ (ج ۱ ص ۸۲)

نہ دینے اور روکنے کے مفہوم کے لیے شح، بخل سے زیادہ بلیغ لفظ ہے، شح بمنزلہ جنس اور بخل بمنزلہ نوع کے ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بخل یہ ہے کہ آدمی اپنے مال کے بارہ میں بخل کرے اور شح یہ ہے کہ اپنے مال و معروف دونوں کے بارہ میں بخل سے کام لے۔ (ج ۴ ص ۸۳ و ۸۴)

رفاہ کے معنی کثرت آرائش اور زیادہ بناؤ سنگھار کرنے کے ہیں، یہ دراصل رفہ سے نکلا ہے، جس کے معنی اونٹ کا روز آنہ گھاٹ پر پانی پینے کے لیے آنا ہے، اگر وہ ایک روز ناغہ سے آئے تو اس کو غب کہا جاتا ہے، اور جب کئی روز کے ناغہ سے آئے تو ظما کہا جاتا ہے۔ (ج ۴ ص ۲۰۸)

طرز ادا اور اسلوب کلام کی توضیح

عربوں کے کلام میں کنایہ کا استعمال بہت عام ہے، اور الفاظ کے انتخاب میں ان کا ذوق اتنا بلند ہے کہ وہ اپنی زبان کو ایسے الفاظ سے آلودہ کرنا پسند نہیں کرتے جو سماعت اور بصارت پر گراں گذریں، (ج ۱ ص ۱۵)

ایک حدیث کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے (انما انا لکم بمنزلة الوالد) اس طرز تخاطب کی خوبی اور بلاغت اس طرح ظاہر کرتے ہیں: "یہ کلام کی تمہید کا طریقہ اور مخاطب کو مانوس کرنے کا انداز ہے، تاکہ اس کی وحشت و اجنبیت دور ہو جائے اور دین کے معاملہ میں اس کو جو دشواری پیش آئے، اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنے میں شرم و جھجک نہ محسوس کرے، جس طرح لڑکا اپنے باپ سے کوئی بات دریافت کرنے میں شرماتا اور جھجکتا نہیں"۔ (ج ۱ ص ۱۴)

اہل عرب کے کلام کی تین صورتیں ہیں (۱) ایجاز و اختصار (۲) عدل و کفاف (اس کو مساوات بھی کہتے ہیں، یعنی بقدر ضرورت الفاظ لائے جائیں، نہ کم نہ زیادہ) (۳) اشباع و زیادتی، (اس کو اطناب بھی کہا جاتا ہے) اطناب کی مثال یہ ہے "فصیام ثلثة ایام فی الحج وسبعة اذا رجعتم کے بعد "تلك عشرة كاملة"۔ حالانکہ سات اور تین کے مجموعہ کا دس ہونا بالکل واضح تھا،

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشہر حرم کے ذکر میں فرمایا "ورجب مضر الذی بین جمادی وشعبان"
اطناب کا مقصد کسی چیز کی تعریف و تاکید اور مکمل وضاحت ہے، کیونکہ تکرار اور کثرت بیان سے کامل معرفت
اور بات پوری طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ اس لیے ہر تکرار و اطناب عیوب کلام میں داخل نہیں ہے۔
ایک حدیث میں ہے (أینقص الرطب اذا یبس) یعنی کیا ہرے کھجور خشک ہونے کے بعد کم ہو جاتا ہے؟
ظاہر ہے یہاں استفہام سوال کے لیے نہیں ہے، کیونکہ اتنی واضح بات آپ سے مخفی نہیں ہو سکتی تھی، بلکہ یہ
استفہام تقریر و اثبات کے لیے ہے۔ اس سے آپ لوگوں کو حکم کی علت اور نکتہ سے آگاہ فرمانا چاہتے
تھے، تاکہ وہ دوسرے امور میں بھی ان کا اعتبار کریں، جریر کا شعر ہے:-

ألستم خیر من رکب المطایا ۔۔۔ واندی العالمین بطون راح

(ترجمہ) تم لوگ سب سے بہترین سوار اور سب سے زیادہ سخی ہو۔

اگر یہاں استفہام کو سوالیہ مانا جائے تو اس میں مدح کی کوئی بات نہیں رہ جائیگی۔ (ج ۳ ص ۶۱)

"عصرین" سے عصر اور فجر کی نمازیں مراد ہیں، اہل عرب دو ناموں کو اسی طرح ملا دیا کرتے ہیں،
جیسے عمرین (ابوبکر و عمرؓ) اسودین (کھجور اور پانی) اور اذانین (اذان و اقامت) وغیرہ۔ عصرین
کے اصلی معنی شب و روز کے ہیں، حمید بن ثور کہتا ہے۔

ولن یلبث العصران یوم ولیلة ۔۔۔ اذا طلبا ان یدرکا ما تیمما

عصران یعنی روز و شب ہرگز رکتے اور ٹھہرتے نہیں، چنانچہ اگر انکو پانے کی کوشش کیجائے تو نہیں پایا جاسکتا،
عصر و فجر کو عصرین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ رات و دن کے کناروں پر ادا کیجاتی ہیں، اس طریقۂ ادا
کا فائدہ حذف و اختصار ہے، کیونکہ دو ناموں کو الگ الگ ذکر کرنے کے مقابلہ میں یہ مختصر اور آسان
صورت ہے (ج ۱ ص ۱۳۴ و ۲۴۷)

بعض اہل لغت کی تردید الفاظ و لغات کا غلط مفہوم بیان کرنے والوں کی جا بجا تردید بھی کی ہے،

مثلاً ایک حدیث (انا الرحمن وھی الرحم شققت لھا من اسمی) کے ضمن میں لکھتے ہیں:-
"ان لوگوں کا خیال صحیح ہے جو لغوی ناموں کے اشتقاق کے قائل ہیں، لیکن بعض لوگ
اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمام اسماء وضعی ہیں، لیکن اس حدیث سے ان کے قول کا
غلط ہونا بالکل ظاہر ہے، اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رحمٰن عربی زبان کا لفظ اور رحمت
سے مشتق ہے، لیکن بعض مفسرین نے اس کو عبرانی قرار دیا ہے، جو صحیح نہیں ہے، رحمان فعلان کے
وزن پر ہے اور یہ ان صفات میں ہے جو مبالغہ کے لیے آتی ہیں، جیسے غضبان اس شخص کو
کہا جاتا ہے جو غصہ سے بھرا ہوا ہو، لیکن اگر کوئی غصہ میں ہو مگر غصہ اس پر پوری طرح مستولی
اور غالب نہ ہوا ہو تو ضجد و حرد وغیرہ کہیں گے۔ اسی طرح سکران نشہ اور مستی میں سرشار شخص
کو کہا جاتا ہے اور اس سے کم درجہ کی سکر کی کیفیتوں کے اظہار کے لیے طرب اور ثمل وغیرہ الفاظ
بولے جاتے ہیں، اسی لیے رحمٰن سے صرف اللہ تعالیٰ ہی کو موسوم کیا جاتا ہے اور اسکی تثنیہ اور جمع نہیں آتی۔ (ج ۲ ص ۸۴)
مشہور حدیث الولد للفراش وللعاھر الحجر کے ضمن میں لکھتے ہیں، "اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں حجر
کے معنی رجم کے ہیں، جو صحیح نہیں ہے، کیونکہ ہر زانی کو سنگسار نہیں کیا جاتا، دراصل یہ محرومی اور گھاٹے
کی ایک بلیغ تعبیر ہے، یہ ایسی ہی ہے جیسے تم کسی کی ناکامی و نامرادی ظاہر کرنے کے لیے اس سے کہتے ہو
مالک غیر التراب اور مافی یدک غیر الحجر، ایک روایت میں ہے کہ اگر کتے کا مالک تم سے اس کی
قیمت مانگے تو اس کی ہتھیلی میں مٹی بھر دو یعنی اسے کچھ نہ دو۔ (ج ۳ ص ۲۸۱)

امام خطابی کے بعض مسامحات گو امام خطابی گوناگوں کمالات کے جامع تھے، مگر احادیث کی تشریح،
مسائل کے استنباط، تنقید و استدلال، اجتہاد و قیاس اور لغات کی تحقیق وغیرہ میں ان سے بعض
فروگذاشتیں بھی ہوگئی ہیں، خصوصاً فقہاء احناف کے مسلک کی تردید میں ان کے بعض دلائل محل نظر ہیں،
اختصار کی وجہ سے ان کی صرف چند فروگذاشتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ایک جگہ انھوں نے حاملہ اور مرضعہ کو شیخ فانی پر قیاس کر کے لکھا ہے:

"گو حاملہ و مرضعہ کے لیے روزہ کی رخصت ثابت ہے، لیکن ان پر قضاء کے ساتھ اطعام (کفارہ) بھی لازم ہوگا، کیونکہ ان کو دوسروں یعنی بچوں پر شفقت اور ان کی جان کے تحفظ و بقا کے خیال سے رخصت ملی ہے، اور شیخ فانی کو روزہ نہ رکھنے کی رخصت محض اس کی ذات کی وجہ سے دی گئی ہے، اس لیے جب شیخ فانی پر اطعام لازم ہے تو ان دونوں پر تو بدرجہ اولیٰ لازم ہوگا، کیونکہ ان کو دوسروں کی وجہ سے رخصت ملی ہے۔" (ج ۲ ص ۹۲)

لیکن یہ قیاس صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ شیخ فانی پر کفارہ اور ان دونوں پر قضا لازم ہے، اس سے ان کی نوعیتوں کا فرق صاف ظاہر ہے، اس لیے حاملہ و مرضعہ پر قضا کے ساتھ کفارہ بھی عائد ہونے کا کوئی سوال نہیں، اسی لیے یہی جمہور فقہاء امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام اوزاعی اور سفیان ثوری اور تابعین میں حسن، عطاء، نخعی اور زہری رحمہم اللہ وغیرہ کا مسلک بھی ہے، البتہ امام شافعی اور امام احمد کا وہ مذہب ہے جس کو امام خطابی نے ترجیح دی ہے، مجاہدؒ سے بھی اس کی روایت کی گئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اس روایت اذا شك احدکم فی صلوتہ فلیتحر الصواب ولیتم علیہ کی تفسیر انھوں نے ابوسعید خدریؓ کی اس روایت اذا شك احدکم فی صلوتہ فلیلق الشك ولیبن علی الیقین سے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "تحری کی حقیقت دو چیزوں میں انسب و اولیٰ اور صحیح و صواب کو اختیار کرنا ہے، اور ابوسعیدؓ کی حدیث میں اولی و احری کا ذکر بنا علی الیقین سے کیا گیا ہے، اس طرح تحری کے معنی یقین بھی ہیں، اس کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے فمن اسلم فاولئك تحروا رشدا۔" (ج ۱ ص ۲۳۹ و ۲۴۰)

لیکن تحری کے معنی یقین لینا صحیح نہیں ہے، شوافع اور امام خطابی کے نزدیک مسئلہ کی

صورت یہ ہے کہ اگر کسی کو شک ہو گیا کہ اس نے دو رکعتیں پڑھی ہیں یا تین تو چونکہ دو رکعت پڑھنے کا قطعی یقین ہے، اس لیے اسی پر بنا کیا جائے گا، اس کے برخلاف احناف کے نزدیک دو یا تین میں جس کی صحت کا زیادہ یقین ہو اس کو اختیار کیا جائے گا، غرض دونوں کے نزدیک تحری کے معنی طلب احری و اولی ہی ہیں، البتہ ایک نے ظن غالب کو اور دوسرے نے بناء علی الیقین کو یہاں احری قرار دیا ہے، اس سے تحری کے معنی یقین نہیں ثابت ہوتا، اور نہ آیت قرآنی میں یہ مفہوم مراد ہے، واللہ اعلم۔

ایک حدیث میں عنق گروہ اور جماعت کے معنی میں آیا ہے، امام خطابی نے اس کی نظیر میں یہ آیت پیش کی ہے (فظلت اعناقهم لها خاضعین) اور لکھا ہے کہ اگر یہاں عنق سے گردنیں مراد ہوتیں تو خاضعات آتا، واللہ اعلم[1]۔ حالانکہ عنق جھنڈ کے معنی میں مجازاً اور کنایۃً آتا ہے، اور جب تک اصل معنی لینے میں کوئی خاص قباحت نہ ہو اس وقت تک اس سے عدول و انحراف صحیح نہیں ہے، اسی لیے مفسرین نے امام خطابی کے مفہوم کو مرجوح قول کی حیثیت سے ذکر کیا ہے، عنق کے معنی رؤساء کے بھی لیے گئے ہیں، لیکن یہ بھی مرجوح قول ہے (کشاف ج ۲ ص ۹۸۰)

البتہ خاضعین یا تو مضاف الیہ کی رعایت سے کہا گیا ہے جس کی مثالیں عربی زبان میں عام ہیں، یا دوسری انسب صورت یہ ہے کہ ظلت یہاں فعل ناقص کے بجائے فعل تام ہے اور خاضعین اعناقهم میں ضمیر سے حال واقع ہے، اور مجرور سے حال واقع ہونے کی مثالیں کلام عرب میں ملتی ہیں، سورۂ ق میں ہے (یوم تشقق الارض عنهم سراعا) یہاں "سراعا" "عنهم" میں ضمیر مجرور سے حال واقع ہے۔

لہ ج ۲ ص ۲۹۳

عروس البلاد بمبئی کی تاریخی سرگذشت

از جناب انور احمد صاحب سوپاروی

(۴)

انگلستان کی نظر ہندوستان پر | پرتگالیوں کی غیر دانشمندانہ اور وحشیانہ پالیسی اور اس کے عبرتناک واقعات یورپ کے سنجیدہ طبقہ کے ذہن کو جھنجھوڑ رہے تھے، اور ان کے عوام ان واقعات سے بہت متاثر تھے، ہندوستان میں سب سے پہلا برطانوی باشندہ طامس اسٹیفن[1] تھا، جو گوا کے ایک کالج (College of Margao) کا ناظم تھا، اس نے اپنے باپ کو ایک خط لکھا کہ ہندوستان کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کیے جائیں، اس کا باپ لندن کا ایک متمول تاجر تھا، چنانچہ ۱۵۸۳ء میں تین تاجر (۱) رالف فچ (Ralph Fitch) (۲) جان نیوبری (John Newbery) اور اسٹوری ہندوستان کی طرف نکل پڑے، ان کے ساتھ لیڈز (Leeds) نامی ایک جوہری بھی تھا، وہ جب ارمز کی بندرگاہ پر اترے تو انھیں پرتگالی حکام نے حراست میں لے لیا، اور قیدی بنا کر گوا میں پہنچا دیا، آخر میں تھامس اسٹیفنز کے اثر و رسوخ سے انھیں رہا کر دیا گیا، ان میں سے فچ، بنگال، برما اور سیلون کی سیاحت کے بعد ۱۵۹۱ء میں اپنے وطن پہنچا، لیڈز نے سلطنت مغلیہ کی ملازمت اختیار کر لی، اور باقی دونوں ہندوستان میں مستقلاً متوطن ہو گئے۔[2]

---

[1] British Beginning in Western India. by H. G. Rawlinson P. 22

[2] Historical Geography of India. by P. E. Roberts vol VII Part I P. 21-22

دراصل سولھویں صدی کے آغاز میں یورپ کی مختلف قومیں ہندوستان سے تجارتی روابط قائم کرنے میں کوشاں تھیں، کیونکہ ان ممالک میں ہندوستان کی دولت و ثروت سے متعلق عجیب و غریب پُر اسرار داستانیں زبان زد خاص و عام تھیں، جو ایک حد تک صحیح تھیں، ہندوستان میں ہر جگہ سونے، چاندی اور قیمتی پتھروں کی ایسی فراوانی تھی کہ اجنبی لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں، اسی دولت کی ہوس میں پہلے پرتگالی، پھر ڈچ اور پھر انگریز آئے۔[1]

۱۵۸۸ء میں آرمیڈا (Armada) کی تاریخی شکست کے بعد انگلستان بحری قوت میں یورپ کے تمام ملکوں سے بازی لے گیا جس سے وہاں کے عوام کے حوصلے بھی بلند ہو گئے، اسی عرصہ میں چند برطانوی سوداگروں نے "کاؤنسل آف لارڈز" میں ایک عرضداشت پیش کی جس میں ہندوستان اور چین کی معروف زمانہ بندرگاہوں سے تجارت کی اجازت طلب کی گئی تھی، یہ عرضداشت ملکۂ انگلستان نے منظور کر لی، اور ۱۵۹۱ء میں کپتان ریمونڈ (Raymond) کو تین عدد تجارتی جہازوں[2] کے ساتھ روانہ کیا گیا، مگر صرف جیمز لنکاسٹر (James Lancaster) اپنا جہاز لیکر راس کماری تک صحیح سلامت پہنچ سکا، اور ریمونڈ کا جہاز راستہ میں تباہ ہو گیا، ۱۵۹۶ء میں تین جہازوں کا دوسرا قافلہ سر رابرٹ ڈوڈلے نے کمانڈر بنجامن ووڈ کے زیر قیادت روانہ کیا، جو ایسا گم ہوا کہ کسی نے اس کے متعلق کچھ نہیں سنا۔[3]

انگریزوں کے لیے ایک بڑی دشواری یہ تھی کہ پرتگالی ارمز (Ormuz) کی بندرگاہ پر اور ہسپانی جبرالٹر پر قابض تھے، جو اس بحری راستہ کے اہم ترین بندرگاہ تھے، برطانوی تاجروں کی

---

[1] India at The Death of Akbar. By W. H. Moreland. P. 222

[2] ان جہازات کے نام یہ ہیں:- (1) The Penelope (2) Merchant (3) (3) Edward Bonaventure

[3] Historical Geography of India. P. 22

نوزائیدہ کمپنی کو متواتر دو خساروں نے مالی حیثیت سے کمزور کر دیا تھا، اس سے چند برسوں کے لیے انگریز سوداگروں کے حوصلے پست ہو گئے، تاہم ہندوستان کے ذائقہ دار مسالوں اور دولت و ثروت کے ہوش ربا قصوں کی کشش انھیں پھر کشاں کشاں مشرق کی جانب کھینچ رہی تھی، چنانچہ ۲۲ ستمبر ۱۵۹۹ء کو ایک تجارتی ادارہ قائم ہوا، جس کا مقصد ہندوستان اور مشرق بعید کے ساتھ تجارتی تعلقات کا آغاز تھا۔ اس کی پہلی نشست میں اراکین نے ملکۂ انگلستان سے سرکاری فرمان حاصل کرنے کی تجویز پاس کی، یہ فرمان ۱۶ اکتوبر کو جاری ہوا، اور ان کا پہلا تجارتی جہاز ۱۳ فروری ۱۶۰۱ء کو ہندوستان کی طرف روانہ ہوا، اتفاق سے اس کے کپتان کا نام بھی لنکاسٹر ہی تھا، یہ جہاز ۱۱ ستمبر ۱۶۰۳ء کو انگلستان واپس گیا، جو ان کی مہم جو طبیعت کی اولین کامیابی تھی، جس نے ان کے ارادوں میں تقویت پہنچائی۔ اس کے بعد تجارتی جہازوں کا دوسرا بحری قافلہ ہاکنز (Hawkins) کے زیر قیادت روانہ ہوا، ہاکنز سورت کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا، اور وہاں سے آگرہ روانہ ہو گیا، اس کے پاس بادشاہ جیمز کا ایک شاہی مراسلہ شہنشاہ ہند کے نام تھا، مگر اس کو مغلیہ دربار سے سورت میں کارخانہ[1] قائم کرنے کی اجازت نہیں ملی[2]، اور وہ ۱۶۱۳ء میں اپنے وطن لوٹ گیا، وہ بھی یہاں کی دولت خصوصاً چاندی کی فراوانی سے بہت متاثر تھا، اس نے لکھا ہے کہ "ہندوستان چاندی کا ملک ہے، جہاں ہر ملک کے تاجروں کے ذریعہ چاندی کے سکے آتے ہیں اور اسی سرزمین کی حدود میں مقید ہو جاتے ہیں[3]"۔ آخر میں کپتان بیسٹ (Capt. Best) کی کوششیں بار آور ہوئیں

---

[1] یورپین اقوام نے تجارتی مرکز کے لیے لفظ (Factory) استعمال کر کے تاریخ پڑھنے والوں کو غلط فہمی کا شکار بنا دیا ہے، یہاں (Factory) کے معنی وہ نہیں ہیں جو اب سمجھے جاتے ہیں، بلکہ اس سے مراد تجارتی مرکز ہے۔ ان کارخانوں یا تجارتی مرکزوں میں انکے تجارتی نمائندے مقیم ہوا کرتے تھے،

[2] India at The Death of Akbar. P. 226. by Moreland

اور مغل دربار سے انھیں سورت میں تجارتی مرکز قائم کرنے کا اجازت نامہ مل گیا، جنوری ۱۶۱۵ء میں سوالی[1] کے مقام پر انگریزوں اور پرتگالیوں کے درمیان سمندری لڑائی ہوئی جس میں انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی، یہ فتح ہندوستان کے ساحل پر ان کے قبضہ کا پہلا قدم تھا[2]۔ اب انگریزوں نے ڈاچ کو اپنی طرف کر لیا تھا، اور ان کی نظریں بار بار جزائر بمبئی کی جانب اٹھ رہی تھیں، اور وہ بمبئی کو حاصل کرنے کی تدابیر پر غور کرنے لگے۔

قلابہ کی خونی چٹان

اسی زمانہ میں انتونیو بوکارو (Antonio Bocarro) نے جزائر بمبئی کی سیاحت کی۔ وہ لکھتا ہے کہ سمندر کی راہ سے بمبئی میں داخل ہونے کے لیے ہمیں شمال مشرق کی طرف سے آنا پڑتا ہے، اس راستہ میں جہاز رانوں کو جزیرۂ کندیل (قلابہ بمبئی) کی خونی چٹان سے چابکدستی اور ہوشیاری کے ساتھ بچ کر نکلنا چاہیے، یہ چٹان نصف لیگ تک سمندر کے سینے میں چلی گئی ہے، جس کی سطح بہت سخت اور خطرناک طور پر ابھری ہوئی ہے، جس سے اگر کوئی جہاز ٹکرا جائے تو پاش پاش ہو جانے کا اندیشہ ہے اور چونکہ یہ ہمیشہ پانی میں ڈوبی رہتی ہے، اس لیے نظر کو دھوکہ ہوتا ہے[3]، جزیرۂ قلابہ میں لارڈ اور دوسرے فوجی افسروں

---

[1] دسمبر ۱۶۱۴ء کو پرتگالی وائسرائے گوا سے ۱۶ جہاز لیکر سورت کی طرف روانہ ہوا، جہاں انگریزوں کے چار جہاز لنگر انداز تھے، ۲۳ دسمبر کو پرتگالی جہاز سورت پہنچے، اور انگریزوں کے جہاز اور سورت کی بندرگاہ کے درمیان میں لنگر انداز ہو گئے، ۲۷ اور ۲۸ دسمبر کو معمولی جھڑپیں ہوئیں، اس وقت انگریزوں کو پرتگالی وائسرائے کی بدنیتی کا علم ہوا، چنانچہ وہ کچھ دور ہٹ کر سوالی کے مقام پر لنگر انداز ہوا، نئے سال کے آغاز میں پرتگالیوں کو تین مزید جہازوں کی کمک پہنچ گئی اور انھوں نے انگریزوں سے ایک فیصلہ کن جنگ کی، اس جنگ میں پرتگالیوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا،

[2] India at The Death of Akbar. P. 226 By Moreland

[3] جان فرائر (John Fryer) جس نے مغربی ہندستان اور فارس کی ۱۶۷۲ء تا ۱۶۸۱ء کے درمیان

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۱۲ پر)

کے مکانات ہیں، اور حفاظت کے لیے ایک برج ہے جس پر چار توپیں نصب کی گئی ہیں، مگر کوئی حفاظتی
دستہ مقرر نہیں ہے[۱]

بمبئی پر نظر

ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے بعد سے اس کے ڈائرکٹروں نے جزائر بمبئی پر قبضہ کرنے
کا نہ صرف خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا بلکہ اس کی کئی بار کوشش بھی کی تھی۔ سوالی کے مقام پر ان کی
کامیابی نے پرتگالیوں کو چوکنا کر دیا تھا۔ اس لیے ۱۶۲۵ء میں انگریزوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ کمپنی کے بقا
اور تجارتی وسائل کی توسیع کے لیے بمبئی کو حاصل کرنا ناگزیر ہے، اور ۱۶۲۶ء میں سورت میں مقیم کمپنی
کے صدر نے ڈچ کمپنی کے افسروں سے اپنی تجویز کا اظہار کیا، مگر انھوں نے اس سے کوئی دلچسپی نہیں لی،
۱۶۴۰ء میں سورت کی کونسل نے بمبئی اور بسین کو خریدنے کی تجویز پاس کی، اور ۱۶۵۴ء میں انگلستان
کے وزیر اعظم کرامول کے نام ایک عرضداشت بھیجی جس میں بمبئی اور بسین کی اہمیت کا تذکرہ
کیا تھا[۲]،

کیتھرائن کی شادی

۱۶۶۱ء میں شاہ پرتگال نے اپنی بہن کیتھرائن کی شادی میں جزیرہ بمبئی اس کے
جہیز میں دیدیا، گویا سلطنت ہندوستان کی کلید برطانیہ کے دربار میں دو سال قبل پہنچ چکی تھی، اس طرح
جون ۱۶۶۱ء کے قرار نامہ کے رو سے بمبئی کا جزیرہ شاہ انگلستان کی ملکیت میں منتقل ہوگیا اور جزیرہ
کی حفاظت کے لیے جو فوج تعینات تھی اس کے کل مصارف کا ذمہ دار ہو گیا، کمپنی کو صرف تجارتی
ضرورت کے لیے اس کے استعمال کرنے کا اختیار رہ گیا[۳]،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۱) حیثیت کی تھی، [illegible] نے بھی اس خطرناک چٹان کا ذکر کیا ہے جس کی زد میں اسکا جہاز آگیا تھا جب وہ گوآ سے سورت کی جانب
سفر کر رہا تھا۔ ملاحظہ ہو:- A new account of East India & Persia. By J. Fryer P. 87/88 vol II

ے۱ The Rise of Bombay. P. 82/83

ے۲ How Bombay was ceded. By J. H. Gonoe; P.6

ے۳ ایضاً ص ۱۱

یہ شادی اس سیاسی مصلحت سے ہوئی تھی کہ پرتگال کو اسپین کی دست درازیوں اور
ہالینڈ کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بچاؤ کا صرف یہی راستہ تھا، کہ انگلستان کے ساتھ تعلقات میں
خوشگواری پیدا کی جائے، اور انگریزوں کی اعانت سے ان دونوں ملکوں کا مقابلہ کیا جاسکے، سلطان
محمود شاہ بیگڑہ بھی کم وبیش اسی قسم کے حالات سے نپٹنے کے لیے عہد نامہ بسین میں پرتگالیوں
سے صلح کرنے پر مجبور ہوا تھا، جب اس کو ہمایوں کے حملہ کا خوف تھا،

بمبئی کی سپردگی میں حیلے

مارچ ۱۶۶۲ء میں پانچ انگریز اول آف مارلبرو (Earl of Marlborough) کی قیادت میں بمبئی کی طرف روانہ ہوئے، ان کے ساتھ چار سو
نفوس پر مشتمل ایک فوج بھی تھی، بمبئی کے ساحل پر پہنچنے کے بعد انھوں نے پرتگالیوں سے جزائر بمبئی
سے دست بردار ہونے کا مطالبہ کیا، انھوں نے حیلے بہانے شروع کیے۔ وہ صرف بمبئی ان کے
سپرد کرنے پر آمادہ تھے، کیونکہ اس وقت تک ان کو ان کی حکومت کی طرف سے اس کا واضح
حکم نامہ نہیں ملا تھا، اس لیے انگریزوں کا یہ قافلہ مایوس ہو کر کاروار کے ساحل پر انجدیو
(Anjdiu) نامی ایک غیر معروف اور غیر آباد جزیرہ پر سکونت پذیر ہوگیا، یہاں وہ دو سال
انتہائی خستہ اور غریب الوطنی کی حالت میں پڑا رہا، اس درمیان میں چار سو فوجیوں میں سے تین سو کے قریب
فوجی اور ایک افسر لقمۂ اجل ہو گئے[۱]، مرنے والوں میں سر ابراہم شپ من (Sir Abrahum Ship man) بھی تھا، جو بمبئی کا پہلا گورنر نامزد ہو کر آیا تھا،

[illegible] پیشین گوئی

عہد نامہ بمبئی سے لندن کے عوام نے مطلق خوشی کا اظہار نہیں کیا، مگر پرتگال کے
باشندے اپنے بادشاہ کی فیاضی سے بہت مسرور تھے، ان کا خیال تھا کہ انگریز اس خطہ کو پانے
کے بعد پرتگالیوں کی پوری طرفداری کریں گے، مگر ہندوستان میں مقیم پرتگالی حکام بالکل ناخوش تھے،

ے۱ On The B'bay Coast & Deccan. By W. A. Brown P. 70

جنوری ۱۶۶۵ء میں گوا کے وائسرائے نے اپنی رپورٹ میں جو اس نے شاہ پرتگال کے پاس بھیجی تھی، کھلے طور پر بمبئی سے دستبرداری کے ہولناک نتائج کی پیشین گوئی کی تھی، اس نے لکھا تھا:۔

"میں بہ حیثیت ایک ادنی غلام کے آپ کے حکم کی تعمیل کے سوا کچھ نہیں کرسکتا، اور یہی میرا فرض بھی ہے، البتہ ایک اندیشے سے اپنے محبوب آقا کو آگاہ کرنا بھی میرا ہی فرض ہے کہ جس روز برطانوی قوم کا بمبئی پر تصرف ہو گیا، ہندوستان ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پرتگالیوں کے ہاتھوں سے نکل گیا"[1]۔

جب جزائر بمبئی انگریزوں کی تحویل میں دینے کا قطعی فیصلہ ہو گیا تو انجذیو سے صرف ایک سو انیس افراد نے ۱۸ فروری ۱۶۶۵ء کو قلابہ کی سرزمین پر قدم رکھا، اس سے قبل ۱۶۵۹ء میں ڈچ نے سیلون سے پرتگالیوں کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا، اور اب ان کی نظریں گوا پر پڑ رہی تھیں، اگر ان کی کوششیں کامیاب ہو جاتیں اور گوا ان کے قبضہ میں چلا جاتا تو دیو ان کے قدموں میں ہوتا، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان میں جمنے کے تمام مواقع ختم ہو جاتے۔

یکم ستمبر ۱۶۶۸ء میں کونسٹنٹ ٹوپل جہاز سورت کی بندرگاہ پر پہنچا، جس میں حکومت انگلستان کا وہ حکم نامہ تھا، جس کی رو سے بمبئی کو کمپنی کو دس پونڈ سالانہ پر کرایہ پر دیا گیا تھا[2]، جس وقت کمپنی نے بمبئی کو اپنی تحویل میں لیا اُس وقت وہاں کی آبادی صرف دس ہزار افراد پر مشتمل تھی، جو ۱۶۷۵ء میں بڑھکر ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی[3]۔

مرہٹوں کی اقبالمندی

یہ مرہٹوں کے عروج اور سیاسی عظمت کا زمانہ تھا، چھترپتی شیواجی مرہٹوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا، اور مہاراشٹر میں انکی سلطنت

[1] On The B'bay Coast & Deccan. by W. A. Brown. P. 72
[2] Bombay. By S. T. Sheppard. P. 17
[3] The rise of B'bay P. 90

قائم ہو چکی تھی اور وہ مغلوں کی طاقت سے ٹکر لے رہے تھے۔ ۱۶۶۶ء میں شیواجی نے دہلی سے فرار ہوتے ہی اپنی مملکت میں توسیع کی مہم جاری کر دی تھی، اور شمالی کوکن کے اکثر قلعوں پر مرہٹوں کا قبضہ ہو چکا تھا، اور شیواجی کی نظر بمبئی کی جانب اٹھنے لگی تھی، چنانچہ ۱۶۷۹ء میں جزیرۂ بمبئی کے قریب جزیرہ کھانڈیری پر مرہٹوں نے قبضہ کر لیا، جس کے انگریز اور پرتگالی دونوں دعویدار تھے، یہ قبضہ صرف جنجیرہ کے سدیوں کی مخالفت کے لیے تھا: اس لیے سدی قاسم نے مرہٹوں کے مقابلہ کے لیے انڈیری کے ٹاپو پر ۱۶۸۰ء میں قبضہ کرکے مورچہ قائم کر لیا،

شیواجی کے زمانۂ عروج میں سہیادری کا مغربی علاقہ بیرونی طاقتوں سے کسی حد تک محفوظ تھا، شیواجی نے گجرات سے ڈچ قوم کو بالکل بے دخل کر رکھا تھا، انھیں صرف وینگرلا (رتناگیری) میں سالانہ خراج کے عوض تجارت کرنے کی اجازت دی گئی تھی، اور بسین، چول وغیرہ مرہٹوں کے زیر انتظام تھے، پنویل اور ایلی فنٹا (پوری) میں تحفظ کے سامان مکمل تھے، بلکہ شیواجی ایک مرتبہ بھیس بدل کر جزیرۂ بمبئی میں بھی آیا تھا، اور مالابار ہل کے کسی ایک غار میں سکونت پذیر تھا[1]،

۵ اپریل ۱۶۸۰ء میں شیواجی فوت ہو گیا اور اس کا بڑا بیٹا سمبھاجی تخت نشین ہوا، جس نے شہزادہ اکبر کو اپنی پناہ میں لیکر اورنگ زیب سے دشمنی مول لی، اور مرہٹوں اور مغلوں میں از سر نو جنگ کا سلسلہ چل پڑا، جس سے داخلی فتنوں کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی گئیں، اور بیرونی طاقتوں سے زور آزمائی کی پہلی سی سرگرمی باقی نہ رہی، اس زمانہ میں خود ایسٹ انڈیا کمپنی اس قدر کمزور تھی کہ بمبئی کی سلامتی خطرہ میں پڑ گئی تھی[2]، اس لیے سورت سے سرجان چائلڈ بمبئی پہنچا تھا، اور حفاظتی انتظام میں مصروف ہو گیا، لیکن اس کو ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، اسی ناامیدی اور یاس کے عالم میں ۴ فروری ۱۶۹۰ء میں مرگیا،

[1] Legends of The Konkan. By Arthur Crawford. P. 87/88.
[2] The Rise of Bombay. P. 134

شاہی جہاز کی انگریز قزاقوں کے ہاتھوں تباہی

سر جائلڈ بمبئی کی حفاظت کی طرف اس لیے متوجہ ہوا تھا کہ مرہٹوں اور سدیوں کی باہمی دشمنی اور جنگ وجدال کے باعث بمبئی کی سلامتی خطرہ میں تھی۔ ۱۱۰۵ھ (۱۶۹۳ء) میں شاہی جہاز (گنج سوائی) کو انگریزوں نے لوٹ لیا تھا،[1] اس سے بڑا جہاز بندرگاہ سورت میں کوئی نہیں تھا، اس میں اسّی توپیں نصب تھیں، جہاز پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے اس کا کل سامان لوٹ لیا اور بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کے ساتھ بڑا نازیبا سلوک کیا، بندر سورت کے نامہ نگار نے اورنگزیب کو خبر لکھکر بھیجی، وہ بہت غضبناک ہوا، اور اعتماد خاں (سورت کا متصدی) اور سدی یاقوت خاں کو لکھا کہ سورت میں انگریزوں کے جو گماشتے تجارت کرتے ہیں انھیں گرفتار کر لیا جائے، اور بمبئی کی تسخیر کیجائے۔[2]

---

[1] ایس، ایم ایڈورڈز نے بھی اپنی کتاب "دی رائز آف بامبے" میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، مگر جہاز کو لوٹنے کا الزام یورپین قزاقوں کے سر تھوپا ہے، جس کی پاداش میں کمپنی کے چند عہدیدار مقیم سورت گرفتار کر لیے گئے تھے۔ (ص ۳۴/۱۳۳)

لیکن خافی خاں نے گنج سوائی کو لوٹنے کا الزام صرف انگریزوں پر رکھا ہے، اور جس کی شکایت اس نے بمبئی کے گورنر سے ملاقات کے وقت کی تھی،

بمبئی میں خافی خاں کا شاندار استقبال کیا گیا تھا، اس نے انگریز گورنر سے کہا تھا: "تمھارے آدمیوں نے جو نازیبا حرکت کی بیہودہ انتہائی احمقانہ ہے، اس لیے تم اس کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لیتے ہو، مگر یہ ایسا ہی ہے کہ ساری دنیا میں سورج چمک رہا ہو اور کوئی عقلمند یہ پوچھے کہ دھوپ کہاں ہے؟

اس جہاز میں میرے جاننے والوں کی ایک جماعت تھی جن کے زبانی پتہ چلا کہ حملہ آور کے چہروں اور ہاتھوں پر زخم کے نشان تھے جو اپنی زبان سے کہہ رہے تھے کہ یہ وہ داغ ہیں جو سدی یاقوت خاں کے محاصرہ کے وقت انکو پہنچے تھے،

اور آج اس کا داغ ہمارے دل سے نکل گیا یعنی ہم نے بدلہ لے لیا" (منتخب اللباب جلد ۲ ص ۴۰۹)

[2] تاریخ ہند جلد ہشتم ص ۴۱۲-۴۱۱

سر جائلڈ مغلوں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے کے حق میں تھا، اس کو مغلوں کی عظیم الشان طاقت اور ہمہ گیر نظامت کا مطلق اندازہ نہ تھا، وہ ایک ایسا خواب دیکھ رہا تھا جس کی تعبیر اس زمانہ میں انگریزوں کی تباہی کے مترادف تھی، مغلوں کی سلطنت کی حدود میں رہ کر ان سے دشمنی مول لینا خود انگریزوں کی تجارت اور قومی ساکھ کو مجروح کرنا تھا،[1] اگر اورنگ زیب چاہتا تو سرزمین ہند سے انگریزوں کا صفایا کر سکتا تھا، مگر اس نے ان کے ساتھ نیک برتاؤ کیا۔

اورنگ زیب کا عتاب

اورنگ زیب کے فرمان میں انگریزوں کو صرف تجارتی سرگرمیوں تک محدود رہنے کی ہدایت تھی، اور سر جائلڈ کی برطرفی کا مطالبہ بھی تھا، جو تمام فسادات کی جڑ تھا، اس سے ایک سال قبل (۱۶ فروری ۱۶۸۹ء) سدیوں کے بحریہ نے بمبئی پر حملہ کر کے ماہم، مجگاؤں اور سیو کو زیر کر لیا تھا، جو ۲۰ جون ۱۶۹۰ء تک قائم رہا، ایک روایت کے مطابق انگریزوں کے قلعہ کے سوا پورے جزیرہ بمبئی پر سدیوں کا تسلط تھا،[2] اور خافی خاں کا بیان ہے کہ سدی یاقوت خاں قلعہ مغنی (بمبئی) کو فتح کرنے ہی والا تھا کہ شاہی حکم کی تعمیل میں اس مہم کو ادھورا چھوڑنا پڑا،[3] یہ انگریزوں کے لیے نازک ترین زمانہ تھا، اگر مغل سردار مختار خاں، سدیوں سے پرخاش نہ رکھتا تو بلاشبہ سدی پورے علاقہ کو زیر کر لیتے،[4] اور انگریز ہندوستان کے ساحل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھاگ چکے ہوتے، اور اس کی تاریخ کا نقشہ کچھ اور ہوتا، بمبئی کے انگریز سدیوں کی موجودگی سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ ہر صورت میں ان سے نجات پانا چاہتے تھے۔[5]

---

[1] History of Aurangzeb. Vol V By J. Sarkar. P 336

[2] Haydn's Dictionary of Dates. By Benjamin Vincent P. 115

[3] منتخب اللباب ج ۳ ص ۳۱۵ [4] Thana Gazetteer. Part II P 481

[5] Bombay and the Sidis. By D. R. Banaji. P 50

اورنگ زیب کے فرمان میں سر چائلڈ کو نو مہینے کے اندر ہندوستان چھوڑ دینے کا حکم بھی تھا، لیکن فروری ۱۶۹۰ء میں اس کی موت نے اس مسئلہ کو حل کر دیا، بادشاہ نے اپنا سابق حکم منسوخ کرکے انگریزوں (ایسٹ انڈیا کمپنی) کو ایک موقع اور دیدیا، اس حکم پر سدی قاسم ۸ جون ۱۶۹۰ء کو بمبئی سے روانہ ہو گیا، اُس وقت انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا، اس مہم میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تقریباً چار لاکھ سولہ ہزار پونڈ صرف ہوئے جو سراسر چائلڈ کی جلد بازی کا نتیجہ تھا۔[1]

سازگار حالات جزائر بمبئی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار اور تجارتی ترقی مقامی طاقتوں کی مرہون منت تھی، پرتگالیوں سے ان کی پرانی عداوت تھی جس سے دونوں میں چپقلش کا لامتناہی سلسلہ جاری تھا، مگر اب پرتگالیوں کا طالع رو بہ تنزل تھا، علاقہ بسین میں ان کا اقتدار گھٹتا جا رہا تھا، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران کو "شرانگیز ہمسایہ" تصور کرتے تھے۔[2] ۱۶ مئی ۱۷۳۹ء میں بسین کا خطہ ان کے ہاتھوں سے نکل کر مرہٹوں کے قبضہ میں جا چکا تھا۔ ان کے بعد کمپنی کو مرہٹوں کی منظم طاقت سے حد شبہ پیدا ہو چلا تھا۔ اس لیے انھوں نے مرہٹوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنے ایک سردار کپتان انچ برڈ (Capt. Inchbird) کو مرہٹہ سردار چیماجی ابا (پیشوا باجی راؤ اول کا بھائی) کی خدمت میں اور کپتان گورڈن کو ستارا کے راجہ کے پاس بھیجا، ان کے ساتھ تحائف بھی تھے، مرہٹوں کے دونوں فریق نے وفد کو یقین دلایا کہ وہ جزائر بمبئی پر فوجکشی کرنے سے اجتناب کریں گے۔[3]

۱۷۳۱ء میں کانوجی آنگریہ کا انتقال ہو گیا۔ ۱۷۳۴ء میں جنجیرہ کے یعقوب خاں نے دار فانی سے کوچ کیا۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے تاریخی میدان میں مرہٹوں کو عبرت ناک

---

[1] Bombay and The Sidis. By D.R Banaji. P. 52
[2] Thana Gazetteer. Part II. P. 495 [3] The Rise of Bbay. P. 132

شکست ہوئی جس سے ان کی طاقت کا شیرازہ ایسا منتشر ہوا کہ پھر وہ سنبھل نہ سکے، یہ واقعات جہاں اندرونی کمزوریوں کا پیش خیمہ تھے، وہاں انگریزوں کی سلامتی اور سیاسی استحکام کا ذریعہ ثابت ہوئے۔ اس عرصہ میں بمبئی کی آبادی میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا تھا، تجارت عروج پر تھی، ۱۶۶۱ء میں یہاں کی آبادی صرف دس ہزار نفوس پر مشتمل تھی، اور ۱۷۴۴ء میں ستر ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

سدیوں اور آنگریہ کی بحری طاقت میں ضعف پیدا ہوتے ہی انگریز مغربی ساحل کے گویا مالک بن بیٹھے، ان کے مقابل اب کوئی طاقت باقی نہ رہ گئی تھی، اور ۱۷۶۰ء میں وہ اس قدر طاقتور بن چکے تھے کہ انھوں نے مرہٹوں کے خلاف سدیوں کا ساتھ دیا، تاکہ مرہٹوں کی رہی سہی قوت کا بھی خاتمہ ہو جائے، ان سے سالسٹ اور بسین کے علاقے طلب کیے مگر مادھوراؤ کے ریجنٹ راگھوناتھ راؤ نے صرف سدیوں کی آزاد مملکت کو تسلیم کیا اور بسین اور سالسٹ سے دستبردار ہونے سے انکار کر دیا۔[1]

نیوبھر اور فاربس بمبئی میں اسی زمانہ میں نیوبھر نے بمبئی کی سیاحت کی، وہ لکھتا ہے:- "شہر صاف و ستھرا ہے، پیداوار میں چاول، ناریل اور نمک کی افراط ہے، پرانا قلعہ مضبوط نہیں ہے، مگر شہر پناہ کافی مضبوط ہے جو شہر کے تحفظ کی ضمانت ہے۔"[2]

۱۷۶۶ء میں فاربس لکھتا ہے کہ بمبئی کی آب و ہوا خوشگوار اور صحت افزا ہے، زمین کے چند قطعے سمندری پانی میں اکثر غرق رہتے ہیں، اس لیے نقل و حرکت میں دقت پیش آتی ہے، یہاں کے سوداگر دنیا کے مختلف ممالک سے تجارت کرتے ہیں، اور یہاں کے بازار بارونق اور تجارتی اشیاء سے بھرے پڑے ہیں، شہر کی لمبائی دو میل ہے۔[3]

---

[1] Thana Gazetteer. Part II P. 498 [2] ایضاً ص ۴۹۹ [3] ایضاً ص ۵۰۰

بسین اور سالسٹ پر حملہ

بمبئی کی روز افزوں آبادی اور تجارتی ترقی کے پیشِ نظر کورٹ آف
ڈائرکٹرز سالسٹ اور بسین پر کمپنی کا تسلط ناگزیر سمجھتے تھے، اس کے لیے ۱۷۷۴ء میں ایک وفد
پونہ روانہ کیا گیا، مگر مرہٹوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی، بلکہ تھانہ کی عسکری قوت میں اضافہ
کر دیا، مرہٹے انگریزوں کی نیت سے واقف تھے، چنانچہ وہی ہوا جس کا انھیں اندیشہ تھا، یعنی
۱۲ دسمبر ۱۷۷۴ء کو جنرل گارڈن کے زیر قیادت ایک فوج تھانہ کی طرف بڑھی، مرہٹوں کی فوج
نے انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، مگر ان کی قسمت کا ستارہ گردش میں تھا، اس لیے شکست ہوئی،
اور ۲۸ دسمبر کو تھانہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ فوج کے دوسرے حصہ نے ورسوا پر قبضہ کر لیا،
پھر کرنجا، ایلی فنٹا اور ہاگ کے جزیرہ پر بھی ان کا تسلط ہو گیا، اور جنوری ۱۷۷۵ء میں پورا
جزیرۂ سالسٹ اور بسین انگریزوں کے زیر نگیں ہو گئے، مگر یہ قبضہ عارضی تھا،

عہد نامۂ بسین

رگھوناتھ راؤ پیشوا اور نانا فرنویس میں تخت کی وراثت پر سنگین تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا،
اس کشمکش میں رگھوناتھ راؤ کو پونہ سے فرار ہونا پڑا، اور وہ گجرات میں پناہ گزیں ہو کر انگریزوں
سے امداد کا طالب ہوا، معاہدۂ سورت کے مطابق انگریزوں نے اس شرط پر امداد کی ذمہ داری لی
کہ وہ سالسٹ، کرنجان، ہاگ اور کھانڈیری پر انگریزوں کی حکومت مستقلاً تسلیم کرے۔

۱۸ ویں صدی کے نصف آخر سے انگریز بسین پر قابض ہونے کی تدابیر کر رہے تھے، آخر کار
اس کا موقع بھی آ گیا اور انگریزوں کی حکومت کے پورے ملک پر قائم ہونے کے لیے حالات
خود بخود سازگار ہو گئے، ۱۸۰۲ء میں یشونت راؤ ہولکر کو فتح حاصل ہوئی، اور باجی راؤ پیشوا
نہاڈ نامی ایک قصبہ میں روپوش ہو گیا، یہاں بھی ہولکر کی فوجوں نے اس کا تعاقب کیا،
پیشوا چول، سالسٹ سے ہوتے ہوئے بسین پہنچ گیا، جہاں انگریزوں کے ایجنٹ برائے پونہ
کرنل کلوز نے اس سے ملاقات کی، دونوں میں دسمبر ۱۸۰۲ء میں ایک معاہدہ ہو گیا، انکی رو سے

انگریز پیشوا کے مقبوضات کے محافظ بن گئے، اور انھیں پونہ میں اپنی فوج تعینات کا اختیار
حاصل ہو گیا،

صلح نامۂ بسین تاریخ ہند میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، جس سے نہ صرف جنوب مغربی ہندوستان
میں انگریزوں کا اقتدار مضبوط ہو گیا، بلکہ مرہٹوں کی رہی سہی طاقت کا بھی کلی طور پر خاتمہ ہو گیا،
جن سے انگریزوں کی ہندوستان میں قدم جمانے میں خطرہ تھا، اس سے بمبئی کی قسمت چمکنے کے
آثار پیدا ہو گئے، اور یہ سنسان اور ویران خطہ رفتہ رفتہ اپنی جغرافیائی ہیئت بدلنے لگا،
تجارت پیشہ اور ہنرمند لوگ جوق در جوق بمبئی میں آ کر بسنے لگے، تجارت اور صنعت و حرفت کو
فروغ ہوتا گیا، اور بمبئی کی آبادی تیزی کے ساتھ بڑھنے لگی، ۱۸۱۲ء میں یہاں بیس ہزار (۲۰)
رہائشی مکانات تھے اور آبادی دو لاکھ بتیس ہزار پر مشتمل تھی، بمبئی کے قلعہ کے اندر دس ہزار آٹھ سو ایک
(۱۰۸۰۱) آدمی بستے تھے،[1]

بمبئی میں آسودگی

قسمت کی یاوری اور ملک کی طوائف الملوکی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو
ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک کی نظامت بخش دی اور بتدریج ان کی حکومت کا دائرہ وسیع
ہونے لگا، ۱۸ ویں صدی میں بمبئی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ریاستی حکومت قائم ہو چکی تھی اور
انگریز بمبئی کی آبادکاری پر خاص توجہ دینے لگے، اور ان کی بدولت بمبئی کی سماجی زندگی کے
تمام شعبوں میں نئی لہر پیدا ہو گئی، ان کے لباس، وضع قطع، کھانے پینے اور رہن سہن کے
طور طریقے کی دلکشی نے مقامی باشندوں خصوصاً پارسیوں کو متاثر کیا، انتظامی امور کیلئے
بورڈ آف ڈائرکٹرز نے حکومت بمبئی کو چار محکمے قائم کرنے کا حکم جاری کیا۔

(۱) مجلس شوریٰ (۲) مجلس محصولات (۳) مجلس عسکریات (۴) مجلس تجارت

---

[1] Shells from The sands of B'bay. by sir D.E Wacha P. 412

شہر بمبئی کی از سر نو آبادکاری کا مسئلہ ابھی زیر غور ہی تھا کہ ۱۷ فروری ۱۸۰۳ء میں بمبئی کے شمالی حصہ میں آگ لگ گئی، اس آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرتے تھے، اور جوناتھن ڈنکن کے بقول اس آگ پر اگر قابو نہیں پالیا جاتا تو سارا شہر اور قلعہ اس کی لپیٹ میں آکر خاکستر بنجاتا، سرکاری بیان کے مطابق ۴۷۱ رہائشی مکانات نذر آتش ہوگئے، اس تاریخی آگ سے جہاں لاکھوں کا نقصان ہوا، وہاں اس سے بمبئی شہر کی صورت گری کو فائدہ پہنچا، اور اس تخریب سے تعمیر کی شکل نکل آئی، چنانچہ شہر کو از سر نو بسانے کا نقشہ بنایا گیا، جس میں وسیع اور کشادہ سڑکوں کا خیال رکھا گیا، اور آہستہ آہستہ شہر کی شکل و صورت میں بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی۔

باجی راؤ کا فرار

عہدنامہ بسین کے وقت انگریزوں نے باجی راؤ پیشوا کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس کو جلد پونا کی گدی پر بٹھائیں گے، چنانچہ باجی راؤ ۱۳ مئی ۱۸۰۳ء کو پونے کے تخت پر بیٹھا، اور ۱۸۱۶ء تک انگریزوں کا وفادار رہا، مگر رفتہ رفتہ انگریز باجی راؤ سے بدگمان ہوگئے اور اس پر الزام لگایا کہ اس نے انگریزوں کی طاقت کو توڑنے کے لیے ہولکر، سندھیا وغیرہ کے ساتھ سازش کی ہے، جس کی کوئی اصلیت نہ تھی، واقعہ یہ ہے کہ انگریز بہر صورت دکن سے مرہٹوں کی رہی سہی طاقت کو ختم کرکے ہندوستان کی سیاسی بساط پر چھا جانا چاہتے تھے، اس لیے اس نام نہاد خطرناک سازش کی اطلاع ملتے ہی بمبئی سے ایک فوج پونا کی جانب بڑھی، ۵ نومبر ۱۸۱۷ء کو کھرکی مقام پر جنگ اور مرہٹوں کو شکست ہوئی، باجی راؤ کو میدان جنگ سے بھاگنا پڑا، مگر ایک عرصہ کے بعد اس نے اپنے کو سرجان مالکم کے سپرد کر دیا، اس طرح سارا دکن انگریزوں کے زیر نگیں ہوگیا۔

بمبئی کے خط و خال بدلنے لگے

مرہٹوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد انگریزوں نے جزائر بمبئی کی

۵ Shell from the sands of B'bay. P. 444/45.

ترقی کی طرف توجہ کی، اور ۱۸۳۸ء میں جزیرہ قلابہ کو جزیرہ بمبئی سے ایک سڑک کے ذریعہ ملا کر قلابہ کو فوجی مستقر بنایا، اپالو بندر میں توسیع کی گئی اور مسافر بردار جہازوں کے لنگر انداز ہونے کا معقول انتظام کیا گیا، آبادی میں اضافہ سے ان تمام جزائر کو ایک دوسرے سے ملانے کا مسئلہ سامنے آگیا، یوں تو یہ جزائر سمندر کے چڑھاؤ کے وقت جدا ہو جاتے تھے، مگر اتار کے وقت لوگ ایک جزیرہ سے دوسرے جزیرہ تک آسانی سے پیدل پہنچ جاتے تھے، اس لیے ان کو ایک دوسرے سے ملانے کا کام شروع کیا گیا۔

۱۸۵۰ء میں سب سے پہلے ریلوے کے کام کی ابتدا ہوئی، اور ۱۶ اپریل ۱۸۵۳ء کو فورٹ جارج سے تھانہ تک ہندوستان کی پہلی ریل پٹریوں پر دوڑنے لگی، جسے لوگوں نے استعجاب کی نظروں سے دیکھا۔ ۱۸۴۰ء میں بمبئی میں سب سے پہلے بینک آف بمبئی کا قیام عمل میں آیا، ۱۸۴۴ء میں اورینٹل بینکنگ کارپوریشن کی ایک شاخ قائم ہوئی، ان کے علاوہ مختلف بینک اور تجارتی ادارے قائم ہوئے، جن کی عمارتیں شہر کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہی تھیں،

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ بمبئی میں

بمبئی ابھی سنور ہی رہا تھا کہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے بمبئی کی سیاحت کی، ان کے "سفرنامۂ حجاز" سے متعلقہ باب کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، جس سے بمبئی کا ایک سو اکتیس سال پرانا نقشہ سامنے آجائے گا:

"۱۳ ربیع الثانی ۱۲۵۴ھ (مطابق ۶ مئی ۱۸۳۸ء) کو گھر بندر (گھوڑ بندر) قیام کیا، اور ۱۴ ربیع الثانی کی دوپہر کے وقت ماہم پہنچے، بمبئی ماہم سے تین کوس ہے، ماہم کو باب بمبئی کہتے ہیں، فقیہ علی مصنف تفسیر رحمانی کا مزار یہاں پر ہے،

یہ بزرگ مولانا عبد الرحمٰن جامی کے ہمعصر تھے۔

میں تمام سامان مہائم چھوڑ کر بمبئی چلا گیا، اور ایک دن ایک رات کے بعد ۱۵ ربیع الثانی کو شام کے وقت واپس آیا، چونکہ قلعہ و شہر کے مکانات کا صحن عنقا ہے اور میں وسعتِ صحن کا خوگر ہوں اس لیے کھیت باڑی میں جو کہ بیرون شہر ہے اور متصل شہر بھی ایک دلکشا باغ اور مصفا و منقش مکان منتخب کر لیا گیا۔ تین روز ترتیب مکان کے انتظار میں مہائم میں ٹھہرنا ہوا۔ مہائم سے بمبئی تک اگرچہ دوکان اور بازار فروشندہ و خریدار نہیں لیکن محلات دلپذیر اور باغات خوش انداز و خوشنما جلوہ گر ہیں۔

شہر بمبئی کے کیا کہنے ہیں۔ اس کے بازار کشادہ ہیں، ہر جنس کی فراوانی ہے، ہمہ اقسام کی اشیا بکثرت دستیاب ہیں۔ اگر بمبئی کے تمام خصوصیات کا ذکر مفصل ہو تو کہنے والا بدحواس ہو جائے اور سننے والا تھک جائے، بہتر ہے کہ اس کا جامع و مانع وصف بیان کیا جائے، اور یہ کہ سوائے اس کے کہ یہاں کی آب و ہوا اچھی نہیں ہے۔ باقی ہر خوبی موجود ہے۔

جزایں قدر بتواں گفت در جمال تو عیب
کہ حال مہر و وفا نیست روئے زیبا را[لہ]

لہ "الفرقان" ص ۲۳ ماہ ذیقعدہ ۱۳۷۸ھ مطابق جون ۱۹۵۹ء ج ۲۶ شمارہ ۱۱/۱
"نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم کا سفرنامۂ حجاز" از مولانا نسیم صاحب

خطبۂ صدارت

آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس

اجلاس ششم منعقدہ دار المصنفین، ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ء

از جناب حکیم عبد الحمید صاحب۔ دہلوی

فضلاء و علمائے کرام!

معلوم نہیں آپ جیسے فضلائے کرام اور ماہرین مطالعات اسلامیہ نے مجھ جیسے محض ایک طبیب کو، جسے اسلام کی مذہبی زبان عربی اور اس کی ثقافتی زبان فارسی کا بھی بس ابتدائی علم ہے، اپنی اس معزز کانفرنس کا صدر کیوں بنایا ہے۔ آپ کی کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں جو اکتوبر ۱۹۶۷ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں مشہور فاضل اور محقق مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، میں صرف اُس کے افتتاحی جلسہ میں شرکت کی عزت حاصل کر سکا تھا، اس کے دو روزہ مذاکرات اور اس کی اختتامیہ نشست میں بھی میں اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے حاضر نہیں ہو سکا تھا۔ تیسرے دن مجھے "خارجاً مسموع" ہوا کہ آپ حضرات نے اپنے آئندہ اجلاس کی صدارت کی عزت بھی مجھے بخش دی، شاید اس عزت افزائی کی وجہ میری اسلامیات سے دلچسپی ہے، جس کے کچھ مظاہر آپ بھی کبھی کبھی دیکھتے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ بھی نہیں کہ مجھے اسلامی علوم و فنون کی ریسرچ اور بعض عملی مسائل سے گہری دلچسپی ہے اور میں ان کی توسیع و ترقی کی لگن بھی دل میں رکھتا ہوں۔

اس صدارت سے آپ کو کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، مجھے یہ سعادت ضرور حاصل ہو گئی کہ اس بہانے

سے اعظم گڈھ حاضر ہونے کا موقعہ مل گیا جو علوم اسلامیہ کی تحقیق کا ایک پرانا اور اہم مرکز ہے، جو علامہ شبلی
نعمانی جیسے فاضل روزگار کا وطن اور ان کی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کا ایک میدان رہا ہے اور جو دارالمصنفین
جیسے ادارہ کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے، جسے مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے خون سے سینچا ہے اور
جو اب بھی بہت سے علماء اور فضلاء کا مرکز ہے۔ مجھے دارالمصنفین میں حاضری سے اس لیے بھی خوشی ہوئی ہے
کہ اس کی مطبوعات سے مجھے ۱۹۲۴ء سے ہی دلچسپی رہی ہے، معارف کے پرانے پرچے میں نے اسی سال
یہاں سے منگوا کر مجلد کرائے تھے، اور اس وقت سے اب تک میرا اس ادارہ سے تعلق ہے، اس چھوٹے
سے شہر اعظم گڈھ اور اس کے اطراف کے لوگوں نے دین اور علم و ادب کی جو خدمت کی ہے، وہ ہمارے
بڑے بڑے شہروں میں بھی نہ ہو سکی، علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے علاوہ اس خطے سے چریاکوٹ،
مبارک پور، محمد آباد اور ولید پور کے مشاہیر اور مولانا حمید الدین فراہی، مولانا عبدالسلام ندوی،
اور اقبال سہیل جیسے عالم اور ادیب ابھرے۔ ان علماء کے فیوض اب تک اعظم گڈھ اور اس کے
اطراف کے مدرسوں کی صورت میں جاری ہیں، ہمیں اس وقت مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اور
مئوناتھ بھنجن کے مفتاح العلوم، دارالعلوم اور مدرسہ فیض عام اپنی گرانقدر علمی خدمات کی وجہ سے
خاص طور پر یاد آرہے ہیں، لادینیت کے پھیلتے ہوئے اندھیرے میں یہ مدرسے آج بھی ایک وسیع
دائرے کو اپنی دینی و علمی خدمت سے روشن کیے ہوئے ہیں۔

حضرات! اس قسم کے اجتماعات کے ناموں میں، جیسا کہ آج یہ ہمارا ہے، پہلے ریسرچ یا تحقیق
کا لفظ کسی نہ کسی طرح ضرور شامل ہوتا تھا لیکن اب یہ متروک ہوتا جا رہا ہے، اس کی جگہ اسٹڈیز،
مطالعات یا دراسات وغیرہ الفاظ نے لے لی ہے۔ الفاظ کے ساتھ اس قسم کے اونچ نیچ کے معاملات
ہوتے ہی رہتے ہیں، جہاں ایک لفظ میں کچھ ناپسندیدہ مفہوم شامل ہوا یا وہ کسی وجہ سے بدنام ہوا تو
اس کی جگہ زیادہ خوبصورت اور پہلو دار لفظ اختیار کر لیا جاتا ہے، برتھ کنٹرول یا ضبط تولید سے

جب لوگ بدکنے لگے تو ان کی جگہ فیملی پلاننگ یا خاندانی منصوبہ بندی کے دلفریب لفظ نے لے لی۔
اقوام مغرب کی شرقیات اور اسلامیات سے دلچسپی بھی خاصی پرانی ہے، اور ان کے بڑے بڑے
فاضلوں نے مشرق کے علوم و فنون میں تحقیق کے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں، بہت سے
علوم جو اپنی جائے پیدائش سے ہی معدوم ہو گئے تھے، وہ ان کی محنتوں کی وجہ سے زندہ ہو گئے،
بہت سے نئے علوم ان کی گہری دلچسپیوں کی وجہ سے عالم وجود میں آئے، اور بہت سے علوم کی شکل و
صورت ہی ان کی "چابک دستی" سے بدل بھی گئی۔ غرض مستشرقین کرام نے واقعی بہت سے کرم ہم
شرقیوں اور شرقیات پر کیے ہیں جن کے لیے ہم کو ان کا ہر لحاظ سے بہت ہی شکر گزار ہونا چاہیے۔

ہمارے ملک میں علمی و تحقیقی کام کرنے والے یوں تو ہر دور میں بکثرت ہوئے ہیں، لیکن تنقید و
تحقیق کے جدید اصول کو اپنانے والے علماء ان یوروپی مستشرقین کے رہین منت ہیں، جنھوں نے
ہندوستان آکر اپنے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ اپنی ان تھک علمی سرگرمیوں کے ذریعہ ہندوستانیوں
کو مشرقی علوم پر کام کرنے کی نئی راہیں دکھائیں، ان مستشرقین میں سرفہرست سر ولیم جونز کا نام ہے
جنھوں نے ۱۷۸۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال قائم کر کے مطالعۂ علوم مشرقی کو نئی
روح بخشی۔ اس ادارے کے مجلہ کے ابتدائی سو برس کے پرچوں پر ایک نظر ڈال لینا ہی انگریز
افسران کے علمی لگاؤ اور ان کی ناقابل فراموش تحقیقی خدمات کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہوگا،
اس مجلہ کے علاوہ، جو اب تک باقاعدگی سے نکل رہا ہے اور تحقیقی کام کرنے والوں کے مقالے شائع
کر رہا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے سینکڑوں اہم عربی و فارسی کتابوں کے متن
اور ان میں سے بہتوں کے انگریزی ترجمے بڑے اہتمام و کاوش سے شائع کیے، یہ متون اتنے اہم
ہیں کہ ان کو امہات کتب کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔ آپ سب صاحبان کو ان کتابوں کی اہمیت
اور افادیت کا پوری طرح علم ہے، اگر یہ کتابیں آج ہمارے سامنے موجود نہ ہوتیں تو تحقیقی کام

کرنے والوں کو کس قدر دشواریاں پیش آتیں اور مشرقی علوم کو کیسا نقصانِ عظیم پہنچا ہوتا،

سر ولیم جونز کے قائم کیے ہوئے ادارہ کے ٹھیک سولہ برس بعد دوسرا ادارہ وجود میں آیا، جس کی عظمت بھی کچھ کم قابلِ ذکر نہیں، یہ تھا فورٹ ولیم کالج جو ۱۸۰۰ء میں قائم ہوا، اس ادارے نے عربی، فارسی اور بالخصوص اردو کی بیسیوں کتابیں اور ترجمے شائع کر کے جو خدمات انجام دی ہیں وہ بھی ہمیشہ یاد رہیں گی، اس ادارے میں کام کرنے والے ابتداءً انگریز تھے لیکن جلد ہی دہلی اور اسکے اطراف سے ہندوستانی علماء و ادباء بھی اس میں آ گئے اور اس طرح ان میں تحقیق کا ولولہ پیدا ہوا، ان دونوں اداروں ہی کی بدولت ہندوستان میں علوم مشرقی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا، ہمارے محققین نے آہستہ آہستہ مشرقی علوم کے تمام شعبوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی اور موجودہ صدی کے اوائل میں وہ علمی میدان میں تحقیق و تدقیق کے اعلیٰ معیار پر پوری طرح کاربند اور پیش پیش نظر آنے لگے۔

ان بے شمار یوروپی مستشرقین کے ناموں میں جن کی کاوشوں نے ہماری علمی راہوں میں نئے چراغ روشن کیے، ایک نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، یعنی چارلس ولکنس کا، جنھوں نے اپنے دوسرے علمی کارناموں کے علاوہ ہندوستان میں سب سے پہلے مقامی زبانوں میں مواد شائع کرنے کے لیے پریس قائم کیا، علوم و فنون کی ترویج میں ان کا یہی ایک کارنامہ ایسا ہے جو ہمیشہ انکی یاد کو تازہ رکھے گا،

جس کانفرنس میں آپ اور ہم آج جمع ہوئے ہیں وہ اور اسی قسم کی ہندوستان میں وقتاً فوقتاً منعقد ہونے والی دوسری کانفرنسیں مثلاً آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس، انڈین ہسٹری کانگریس، انڈین فلاسوفکل کانگریس، وغیرہ بھی مستشرقین کی دین ہیں، اس قسم کی کانفرنسوں کا ایک بڑا مقصد تحقیق کرنے والوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر تبادلۂ خیال کا موقع فراہم کرنا اور اُن میں ربط و تعلق پیدا کرنا ہے، اور یہ علمی و تحقیقی کاموں کے لیے بڑا ضروری ہے، آج کی علوم و فنون کی تیز رفتار ترقی نے تبادلۂ خیال کو اور بھی

لازم کر دیا ہے اور اب یہ ناممکن سا ہو گیا ہے کہ کوئی محقق تبادلۂ خیال کے بغیر کما حقہ تحقیقی کام کر سکے، تبادلۂ خیال کے علاوہ ایسے اجتماعات کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ محققین کو ایک دوسرے کی علمی سرگرمیوں کا علم ہو جاتا ہے، اور اس طرح کام کی تکرار کم ہو جاتی ہے،

حضرات! اسلامی علوم و فنون اور ان کی تحقیق سے دلچسپی اب ایک یا چند گنے چنے ملکوں یا اشخاص تک محدود نہیں رہی ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہر ترقی یافتہ ملک بلکہ بہت سے ترقی پذیر ممالک بھی مختلف وجوہ سے اسلام اور مسلمانوں سے دلچسپی لے رہے ہیں، اور اپنی تعلیم گاہوں اور تحقیقی مرکزوں میں ان کے لیے زیادہ سے زیادہ گنجایش نکال رہے ہیں، خود اپنے ملک میں فی الحال ہم کو اسلامی علوم و فنون سے غفلت اور بے پروائی کی بجا شکایت ہو سکتی ہے، اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے کہ بعض سیاسی حالات کی وجہ سے جو کام پہلے چل رہے تھے اُن میں بھی رخنہ پڑا ہے اور بعض صورتوں میں عمداً اسلامی علوم و فنون کو پس پشت ڈالا گیا ہے، لیکن آپ دیکھیں گے کہ سیاسی مطلع ذرا صاف ہوتے ہی اس ملک کو بھی اسلام اور اسلامی علوم و فنون سے گہری دلچسپی لینی ہی پڑے گی، جب وہ ممالک جن کا اسلام اور مسلمانوں سے کوئی خاص تعلق بھی نہیں ہے، اسلامی علوم و فنون سے دلچسپی لے رہے ہیں تو ہندوستان کیسے ان سے مستقل طور پر غفلت برت سکتا ہے، جس کا اسلام اور مسلمانوں سے صدیوں سے اتنا گہرا تعلق رہا ہے، اور اس تعلق نے جو اثرات ان دونوں پر چھوڑے ہیں وہ خود ایک ایسا تحقیقی موضوع ہے جس کی ندرت کی نظیر مشکل ہی سے کسی اور جگہ مل سکے گی۔

ہم اپنے متعلق اور اپنے علوم و فنون کے متعلق دوسروں کی عدم دلچسپی اور بے پروائیوں کی شکایت تو کرتے رہتے ہیں، لیکن کیا ہم نے بھی کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈالا ہے کہ اسلامی علوم و فنون اور عظیم مسلم تہذیب و تمدن پر ہم نے تحقیق کے کون سے کارنامے انجام دیے ہیں، ریسرچ اور علمی تحقیق کے معاملہ میں مسلمانوں کا مزاج بھی ایک ایسا عجیب و غریب موضوع ہے، جس پر ریسرچ برائے ریسرچ کے علمبردار بھی خوب

داد تحقیق دے سکتے ہیں، آج سے دس گیارہ سال پہلے جب میں کلیاتِ طب کے مسئلہ مزاج، طبیعت، مدبرۂ بدن، عدل، تعدیل اور اعتدال طبی اور جسم و روح کے تعلق پر ریسرچ کا خاکہ بنا رہا تھا، تو میری توجہ ہندوستانی اور خصوصاً مسلمانوں کے ملی مزاج پر لگ گئی تھی اور میں نے محسوس کر لیا تھا کہ جدت و قدامت کی آویزش اور مسئلہ ارتقاء کے متعلق ہمارا ذہن بالکل صاف نہیں ہے، بلکہ اس میں ایک عجیب سا تضاد بھی ہے، جس نے ہماری عملی قوتوں کو شل کر کے رکھ دیا ہے، اور کسی کام کو منظم (سسٹمیٹک) طور پر کرنے کی ہم میں صلاحیت نہیں رہی ہے، اس موقع پر ادارۂ تاریخ و تحقیق طب کی طرف سے تین سوال نامے دنیا کے بہت سے مفکرین اور مورخین اور مصلحین وغیرہ کو بھیجے گئے تھے، ان میں سے پہلا سوال نامہ غیر طبی اور عمومی یا تمہیدی نوعیت کا تھا، جس پر بہت سے جوابات بھی موصول ہوئے ہیں، اس موقع پر ان سوالات و جوابات کا خلاصہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اس سوال کے جواب میں کہ مشرق میں تحریک ہائے احیائے مغرب میں نشاۃ ثانیہ سے کن باتوں میں مختلف ہیں، زیادہ تر لوگوں نے کہا کہ مشرق میں تحریک احیاء روایت پسندی پر مبنی ہے جبکہ مغرب میں نشاۃ ثانیہ کی بنا روایت سے ہٹ کر سائنس اور ٹکنالوجی پر پڑی، اس طرح دونوں نقطہ ہائے نظر میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے،

ایک اور سوال یہ کہ کیا مذہبی اقدار یا کسی مخصوص فلسفہ کے ماتحت علوم و فنون کا مطالعہ سائنٹفک کہا جا سکتا ہے، تمام جوابات نفی میں آئے، اس کا بھی جواب بالاتفاق نفی میں تھا کہ کیا کسی علم یا فن کو "سند" رکھتے ہوئے سائنٹفک بنایا جا سکتا ہے،

ایک نہایت اہم سوال یہ تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض قومیں مثلاً یونانی، رومی، عرب اور ایرانی وغیرہ جنھوں نے کسی خاص علم یا فن کو جنم دیا اور انھیں فروغ بخشا، اب ان ہی علوم و فنون کی ترقی و احیاء سے یکسر غافل نظر آتی ہیں، لیکن بعض قومیں جن میں ہندوستان اور چین شامل ہیں،

اپنے پرانے اور مردہ یا نیم مردہ علوم و فنون سے کسی قیمت پر علیحدہ ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں، ظاہر ہے کہ یہ سوال نہایت غور و فکر چاہتا ہے اور بذاتِ خود ایک تحقیقی موضوع ہے، غالباً یہی وجہ ہو کہ اس سوال کے جواب میں زیادہ طبع آزمائی نہیں دکھائی گئی اور جو چند جواب آئے وہ بھی ایک دوسرے کے ضد تھے، اور گویا یہ ظاہر کر رہے تھے کہ اس پیچیدہ اور اختلافی مسئلے پر بڑی کاوش سے تحقیق کی ضرورت ہے۔

اگر آپ ان سوالات کا تجزیہ کریں تو دیکھیں گے کہ بنیادی مسئلہ صرف ایک ہی ہے جسے صرف دو لفظوں میں پیش کیا جا سکتا ہے، جدت و قدامت۔ یہ مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ ہر زمانے میں روایت پسند اور روایت شکن لوگوں میں تصادم رہا ہے، اور اگر غور کیجیے تو کارل مارکس کی یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ تمام ترقی مختلف مکتب ہائے خیال اور متنوع نظام کار میں اختلاف و امتزاج کی پیداوار ہے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ آج جدت کے معنی وہ نہیں ہیں جو اٹھارہویں صدی سے پہلے تھے، پہلے جدت کا مطلب پرانی قدروں اور عقیدوں سے بسبب یا بے سبب احتراز تھا، اب جدت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر خیال اور ہر عقیدے کو قبول کرنے سے پہلے اسے عقل و دانش کی کسوٹی پر پرکھا جائے، اگر کوئی خیال، کوئی عقیدہ اس کسوٹی پر پورا نہیں اترتا تو وہ جدت کے زمرہ سے خارج ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں وہ ان سائنٹفک ہے اور قدیم یا دقیانوسی ہے۔ جدت و قدامت کی پرانی آویزش اور مسلمانوں پر اس کے احساس نے بھی مجھے اس وقت دور تک پہنچا دیا تھا اور اس مسئلے کی گہری تحقیق کا ایک خاکہ میں نے بنایا تھا، جو میرے کاغذات میں محفوظ ہے، جنوری ۱۹۵۹ء کا یہ نوٹ میں یہاں نقل کر رہا ہوں، ممکن ہے اب وہ کسی من چلے کی توجہ کا مرکز بن جائے اور یہ اہم کام جو میں اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے اب تک نہیں کر سکا، وہ اس طرح پورا ہو جائے۔

مسئلۂ جدت و قدامت

جدت و قدامت کے مسائل پر ہماری معلومات محدود ہیں۔ ضرورت ہو کہ انکا وسیع طور پر مطالعہ کیا جائے:-

توضیح (۱) قدامت اور جدت دونوں انسانی فطرت کے تقاضے ہیں۔ غالباً اس کی سب سے بڑی شاہد یہ حقیقت ہے کہ

بڑے سے بڑا جدت پسند قدامت سے بالکلیہ الگ نہیں رہ سکتا، اور نہ کوئی کٹر سے کٹر قدامت پسند جدت سے اپنا دامن بچائے رکھ سکتا ہے۔

(۲) قدامت اور جدت کی آویزش ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے اور غالباً ہمیشہ رہے گی۔

(۳) جدت تبدیلی کی دلدادہ ہے، لیکن اس کے بھی قوانین ہیں۔

(۴) افراد اور جماعتوں کی معاشی اور معاشرتی جد و جہد اور علوم و فنون کی بحثوں کی طوالت، خصوصاً سائنس اور مذہب کی معرکہ آرائیاں، یہ سب جدت و قدامت کی آویزش کی مختلف صورتیں ہیں۔

حدود مطالعہ

(۱) قدامت و جدت کی آویزش کی تاریخ۔

(۲) قدامت و جدت کا نفسیاتی اور فلسفیانہ جائزہ۔

(۳) مختلف مذہبی، نسلی اور ملکی جماعتوں اور گروہوں میں قدامت اور جدت کی آویزش کا مطالعہ

(۴) قدامت اور جدت کی آویزش اور مسلمانوں کے ملی مزاج پر جامع تحقیق۔

(۵) قدامت اور جدت کی آویزش اور ہندوؤں کا قومی مزاج اور اسکی بعض نمایاں خصوصیات کا مطالعہ۔

(۶) برصغیر کے مسلمان اور قدامت اور جدت کی آویزش۔

(۷) برصغیر کے مسلمانوں کے مذہبی اور غیر مذہبی علوم و فنون اور انکی آویزش کی تاریخ کا مطالعہ۔

بعض نکات

(۱) ماضی، حال اور مستقبل کے باہمی رشتے۔

(۲) حال کے تعین میں ماضی مفید ہو سکتا ہے، لیکن کیا مستقبل میں افادیت کی امید میں ماضی کی حفاظت ضروری ہے؟

(۳) یونان، روم اور ایرانِ قدیم کا بحیثیت قوم خاتمہ، لیکن ہندو "قوم" کا بچے رہنا (عقیدۂ تناسخ سے اس کا رشتہ)

(۴) شاندار موت اور اہم و عالمگیر انسانی "چندہ" (کنزرمی ہیوشن)، یا طویل العمری اور تھوڑا تھوڑا

اہم یا غیر اہم مقامی چندہ؟

(۵) مسلمانوں کا ملی مزاج ماضی سے قطعی بے تعلقی کو برداشت نہیں کر سکتا۔

(۶) ماضی سے چمٹے رہنا، اس سے بالکل بے پروائی بلکہ اس کی مٹی پلید کرتے رہنا بھی مسلمانوں کے ملی مزاج کی ایک خصوصیت ہے۔

---

(۱) کیا جدت و قدامت کے مسئلہ کے حل کے لیے ایک یا چند عمومی کلیات وضع کیے جا سکتے ہیں؟

(۲) کیا کسی ملک یا قوم کے لیے جدت و قدامت کے مسئلہ کے حل کے طور پر ایک یا چند عمومی کلیات وضع کیے جا سکتے ہیں؟

(۳) کسی علم و فن کے لیے جدت و قدامت کے مسئلہ کے حل کے طور پر ایک یا چند عمومی کلیات وضع کیے جا سکتے ہیں؟

آپ کو معلوم ہی ہے کہ اسلامی ریسرچ اور مطالعات کا ایک ادارہ دہلی میں پچھلے سال سے قائم ہے۔ ۱۹۶۴ء میں ایک اسکیم بھی انٹرنیشنل کانگریس آف اورینٹلسٹس کے چھبیسویں اجلاس منعقدہ دہلی کے موقع پر پیش کی گئی تھی۔ ادارہ موجودہ محدود جگہ میں اپنا کام کر رہا ہے، لیکن پوری اسکیم پر اس وجہ سے عمل نہیں کیا جا سکا کہ انسٹی ٹیوٹ کے لیے مستقل زمین کا مسئلہ ابتک طے نہیں ہو سکا، دفتری لیت و لعل اور تاخیر کے اسباب سے کون ہے جو نا واقف ہے، بہرحال انسٹی ٹیوٹ کی بڑی جد و جہد کا نتیجہ آخر کار اچھا ہی نکلا ہے اور دہلی ایڈمنسٹریشن نے حکومت ہند کی وزارتِ تعلیم کی سفارش سے انسٹی ٹیوٹ کو تین ایکڑ زمین رعایتی نرخ پر دینے کا فیصلہ کر دیا ہے، جو عنقریب اس کو ملنے والی ہے، یہ قطعۂ زمین شہر دہلی سے بارہ میل دور تغلق آباد میں واقع ہے،

جہاں انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ کا کیمپس بھی ہے، اور جس کی مین بلڈنگ کا افتتاح ۲۰ فروری ۱۹۷۰ء کو ہو رہا ہے، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے ۱۹۶۳ء کی اسکیم ایک بار پھر دنیا بھر کے ماہرین اسلامیات اور بعض اصحابِ فکر کو تنقید اور نظرثانی کے لیے بھیج دی گئی ہے، ان جوابات کی روشنی میں نظرثانی اور اصلاح کا کام بلا تاخیر کر لیا جائے گا، اور اس انسٹی ٹیوٹ کی مین بلڈنگ کا جو میوزیم اور لائبریری پر مشتمل ہوگی، سنگِ بنیاد بھی بہت جلد رکھ دیا جائے گا۔

انسٹی ٹیوٹ کی توجہ آج کل مجوزہ لائبریری کے کلاسیفیکیشن سسٹم کی طرف ہے، تمام سسٹمز کا گہرا مطالعہ کیا جا رہا ہے لیکن کوئی ایسا سسٹم جو مجوزہ متنوع اور وسیع لائبریری کے لیے موزوں ہو، ابتک سامنے نہیں آیا ہے، ماہرین کے ابتک کے جوابات بھی اس مسئلے کا کوئی حل پیش نہیں کر سکے ہیں، اسی طرح مجوزہ میوزیم اور اس کے مختلف شعبوں کی ترتیب و تنظیم کا مسئلہ بھی مختلف قسم کی عملی دشواریاں پیش کر رہا ہے، بہرحال ان مشکلات کا کوئی نہ کوئی حل نکلے گا ہی، اور کام انشاء اللہ پورا ہی ہوگا، اس اسکیم کی تکمیل میں اور جذبات کے علاوہ جو جذبہ کام کر رہا ہے اسے اُن بزرگوں کی زبانی جو اس سرزمین میں آرام فرما رہے ہیں، ذرا ترمیم کے ساتھ اس طرح ظاہر کیا جا سکتا ہے،

ہمیں یک لفظ از ریسرچ، اصل مدعا باشد　　　　کہ ایں سر رشتۂ تحقیق با در دستِ ما باشد

اسلامی ریسرچ اور اس کے مقاصد پر بہت سی بحثیں ہوئی ہیں اور مزید ہو سکتی ہیں، مقصد تحقیق اسلامیہ پر ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کا مضمون جو ان کے رسالہ اسلامک ایجوکیشن میں گذشتہ برس قسط وار "اسلام اینڈ سائنس" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا، ممکن ہوا تو میں اسے دوبارہ بھی پڑھوں گا، ہر کلمہ گو یہی چاہے گا کہ سائنس اور تمام علوم و فنون کو بھی کلمہ پڑھوا دیا جائے اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ تمام مذاہبِ عالم میں اگر کوئی مذہب سائنس کے ہاتھ میں تسبیح پکڑا سکتا ہے

تو وہ اسلام ہی ہے، خدا کرے ڈاکٹر صاحب مرحوم کا خواب جلد پورا ہو اور ایسے اسباب بھی مہیا ہوں جو اس تخیل کو عملی جامہ پہنا سکیں، فی الحال تو اس کی ضرورت ہے کہ اسلام، مسلمانوں اور اسلامی علوم و فنون کے متعلق ہر قسم کا ڈیٹا ایک جگہ جمع ہو جائے، تحقیقی ذوق والوں کے لیے ایک مرکز مہیا ہو جائے جو ہر قسم کی اور جدید ترین سہولتوں کا حامل ہو، اس کام کے اسباب تو پیدا ہو ہی چکے ہیں، خدا نے چاہا تو اس کی تکمیل بھی ہو ہی جائے گی۔

حضرات! آپ تو متوقع ہوں گے کہ کسی موضوع یا مطالعات اسلامیہ پر ہی سہی، کوئی فلسفیانہ اور فنی بحثیں سنیں گے، یہاں محض چھوٹی موٹی باتیں سن کر آپ اکتا بھی رہے ہوں گے، میں مجبور ہوں، مجھے تو سیدھی سادی باتیں ہی آتی ہیں، میں تو بس اتنا ہی پڑھتا ہوں جتنا مجھے عمل کے لیے ضروری ہوتا ہے، اتنی ہی دور دیکھتا ہوں جہاں سے منزل صاف دکھائی دے رہی ہو، اور اتنا ہی چلتا ہوں جو قطعِ منزل کے لیے ضروری ہے، اس سے کم نہ زیادہ۔

آخر میں، میں پھر آپ سب حضرات کا اور کانفرنس کے منتظمین کا اور دعوت دینے والوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے یہ عزت بخشی اور میری باتوں کو صبر و سکون سے سنا، سب سے آخر میں، میں آپ کو نئے سال کی مبارکباد بھی پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ آنے والا سال ہم سب کے لیے فلاح و ترقی کا سال ہو، اور جو مشکلات ہمارے ملک کو اور ہماری قوم کو درپیش ہیں، وہ دور ہوں اور اقوامِ عالم میں ہمیں سرخروئی حاصل ہو۔ آمین۔

دار المصنفین میں اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا چھٹا اجلاس

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

آج سے بارہ برس پہلے آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کی بنیاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اسلامیات کی تحریک سے جناب ڈاکٹر عبد العلیم کی کوششوں سے پڑی، جو اس وقت اس شعبہ کے صدر تھے، اس کا اجلاس ہر دو سال کے بعد ہوا کرتا ہے، شروع کے غالباً تین اجلاس مسلم یونیورسٹی ہی میں ہوئے، پھر یونیورسٹی سے باہر نکلی تو اس کی حیثیت کل ہند کی ہوگئی، اس کا ایک اجلاس حیدرآباد اور ایک جامعہ ملیہ دہلی میں ہوا، اس کا چھٹا اجلاس دار المصنفین کی دعوت پر اعظم گڈھ میں ۳۰ و ۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ء کو ہوا،

دار المصنفین کے انتظامی فرائض میرے ہی سپرد ہیں، پھر کانفرنس کے عہدیداروں نے مجھکو اس کا لوکل سکریٹری بھی بنادیا، اس لیے اس کی تیاری میں میری ذمہ داری دہری ہوگئی ہیں، ۲ر اکتوبر ۱۹۶۹ء کو دار المصنفین کے کام سے پاکستان چلا گیا، خیال تھا کہ ایک مہینہ کے اندر واپسی ہوجائے گی، لیکن وہاں بعض مجبوریوں سے ۲ دو مہینے رکنا پڑا، اس سفر میں یہ خلش برابر رہی کہ واپسی میں دیر ہوگی تو کانفرنس کی تیاریاں خاطر خواہ نہ ہوسکیں گی، پاکستان سے واپسی میں علی گڑھ اتر کر کانفرنس کے عہدیداروں سے ضروری ہدایتیں لیں، ۸ر دسمبر کو دار المصنفین واپس ہوا تو تیاریاں شروع کردی گئیں، جہاں اور انتظامات ہوئے وہاں ایک علمی نمائش بھی ترتیب دی گئی، گمان تھا کہ اعظم گڈھ جیسی دور افتادہ جگہ میں کانفرنس کے زیادہ نمائندوں کا آنا ممکن نہ ہوسکے گا، لیکن توقع کے خلاف ۲۰ر دسمبر ہی سے معزز مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی، سب سے پہلے ڈاکٹر جی۔ آر۔ عبد اللہ، ہیڈ شعبۂ تعلیم

کشمیر یونیورسٹی، سرینگر سے پہنچے، آتے ہی کہا کہ صرف کانفرنس کی شرکت کے خیال سے نہیں آیا ہوں بلکہ دار المصنفین سے استفادہ کرنے کی غرض سے بھی آگیا ہوں، کشمیر یونیورسٹی ہی میں پروفیسر عبد القادر سروری شعبۂ اردو کے صدر ہیں، وہ سرینگر سے حیدرآباد گئے اور وہاں سے اعظم گڈھ تشریف لائے تو فرمایا کہ دار المصنفین دیکھنے کی بڑی دیرینہ آرزو تھی جو الحمد للہ اب پوری ہوئی، مدراس یونیورسٹی کے عربی، فارسی اور اردو کے صدر جناب افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری صاحب بھی طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے آئے، دار المصنفین ان کا شروع سے علمی قبلہ رہا ہے، اس لیے یہاں سراپا عجز و نیاز بن کر آئے، انسٹیٹیوٹ آف اڈوانسڈ اسٹڈیز شملہ کی نمائندگی ڈاکٹر مشیر الحق نے کی، جناب مسعود حسن صاحب صدر شعبۂ عربی کلکتہ یونیورسٹی دار المصنفین کے بڑے قدردان ہیں، وہ غالباً کانفرنس کے پہلے کسی اور اجلاس میں شریک نہیں ہوئے، دار المصنفین کی کشش ان کو یہاں کھینچ لائی، جناب عطا کریم برق صاحب صدر شعبۂ فارسی کلکتہ یونیورسٹی، جدید فارسی کے بڑے ماہر ہیں، ان کو بھی دار المصنفین سے گہرا لگاؤ ہے، وہ یہاں آئے تو کانفرنس سے زیادہ یہاں کی تمام چیزوں سے زیادہ دلچسپی لی، ڈاکٹر محمد صابر خاں ڈی۔ فل (آکس) مغربی بنگال کے مختلف سرکاری کالجوں کے پرنسپل رہ چکے ہیں، برسوں سے دار المصنفین آنے کا ارادہ کر رہے تھے، کانفرنس میں شرکت کرکے اس ارادہ کو بھی پورا کیا، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے عبد السبحان صاحب کے خطوط سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کانفرنس میں شرکت کرنے اور دار المصنفین دیکھنے کے لیے بے چین ہیں، مولانا حافظ محبوب الرحمٰن ازہری صاحب نے کلکتہ مدرسہ کی نمائندگی کی، وہ بھی دار المصنفین کے پرانے پرستاروں میں ہیں، بہار کے بہت سے علمی خدمت گذار اس ادارہ میں رہ چکے ہیں جس سے بہار والوں کو اس سے بڑا قلبی تعلق ہے، اسلیے وہاں کے اہل علم کانفرنس میں شرکت کرکے علمی مے دو آتشہ کا جام پینے کو آئے، پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی سابق ڈائرکٹر فارسی و عربی انسٹیٹیوٹ پٹنہ اکتوبر میں آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کے شعبۂ اسلامیات کی صدارت کلکتہ میں کی ہے، وہ بھی آئے اور ان کے ساتھ مولوی عزالدین ندوی بھی آئے، پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر سید حسن پر انکی یونیورسٹی کو ان کے بہت سے کمالات پر فخر ہے، وہ مجھ سے دلی تعلق رکھتے ہیں،

اس لیے دارالمصنفین میں کانفرنس کی شرکت کے لیے بہت شوق سے آگئے، ان کے جلو میں جناب نیر حیدر صاحب
ڈائرکٹر فارسی و عربی انسٹیٹیوٹ پٹنہ اور ڈاکٹر محمد مظفر لکچرار فارسی مگدھ یونیورسٹی بھی تھے، ہندو یونیورسٹی سے
جناب ابن الحسن اور جناب سید سلیمان عباس آئے، وہ نہ آتے تو اپنے پڑوسی ضلع کا حق ادا کرتے، الہ آباد
یونیورسٹی کے جناب عبداللطیف الہندی، اسلامیات کے سلسلہ کی کسی کانفرنس کو نہیں چھوڑتے، اسلیے یہاں آکر بھی
اپنی وضعداری کو قائم رکھا، مجیدیہ انٹر کالج کے ہردلعزیز پرنسپل جناب ریاض الدین صاحب باضابطہ نمائندہ بنکر آئے،
مسلم یونیورسٹی والوں پر تو کانفرنس کا حق ہے، اس لیے وہاں سے کافی نمائندے آگئے، دارالمصنفین کی طلائی جوبلی
میں ڈاکٹر عبدالعلیم نہ آسکے تھے، اسلیے جوبلی کی عدم شرکت کی تلافی اس کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہوکر کی، ان کا
خوبیاں ہو کہ دارالمصنفین سے ان کا تعلق چالیس سال سے ہے، وہ اب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہیں،
اس لیے ان کی تشریف آوری سے کانفرنس میں وزن پیدا ہوا، کانفرنس کے قائم مقام جنرل سکریٹری ڈاکٹر
سید مقبول احمد صدر شعبۂ ویسٹ ایشین اسٹڈیز کا تو آنا لازمی تھا، کیونکہ ان ہی کو کانفرنس کی کارروائیوں کو
قاعدے اور ضابطے کے مطابق عمل میں لانا تھا، ان کے ساتھ ڈاکٹر اقبال احمد انصاری ریڈر شعبۂ اسلامیات
مسلم یونیورسٹی بھی تھے، جو کانفرنس کے ٹریژرر بھی ہیں، ان کو کانفرنس کی کارروائیوں کو حسن وخوبی سے انجام
دینے کا بڑا تجربہ حاصل ہوگیا ہے، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کی نمائندگی اس کے فاضل اور لائق صدر جناب مولانا
سعید احمد اکبر آبادی نے کی، جو ایک مشہور مصنف اور خطیب بھی ہیں، انکی معیت میں جناب فضل الرحمن گنوری بھی تھے
جو جس کانفرنس میں شریک ہوتے ہیں اپنے راسخ عقیدے کا نقش چھوڑ جاتے ہیں، مفتی رضا انصاری صاحب
فرنگی محلی اب مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات سے وابستہ ہوگئے ہیں، وہ بھی آئے، اس یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کی نمائندگی
جناب ڈاکٹر نبی ہادی ریڈر اور جناب وحید اشرف صاحب نے کی، اس کے شعبۂ اسلامیات کی طرف سے جناب محمد راشد ندوی
لکچرار، ڈاکٹر محمود الحق لکچرار اور احتشام بن حسن ریسرچ اسکالر آئے، مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ کی نمائندگی جناب
وقار الزماں نے کی، دلی سے کانفرنس کے صدر جناب حکیم عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ اجلاس کی زینت بنکر تشریف لائے۔

ان کے ساتھ مولانا سجاد حسین پرنسپل مدرسہ فتحپوری بھی تھے، جو اپنی نجی صحبت میں ہمیشہ باغ وبہار بنے رہتے ہیں، حکیم صاحب
موصوف کے ساتھ جناب اوصاف علی صاحب بھی تھے، جو دہلی کے اسلامک انسٹیٹیوٹ کے سکریٹری ہونے کی حیثیت سے
مفید خدمات انجام دے رہے ہیں، ڈاکٹر امیر حسن عابدی صدر شعبۂ فارسی وعربی دہلی یونیورسٹی بھی آئے، جو انڈو پرشین
لٹریچر کی خدمات کی بنا پر نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران اور افغانستان میں شہرت حاصل کر رہے ہیں، وہ فارسی
میں سبک ہندی کے بڑے حامی ہیں، ان کے ساتھ ڈاکٹر مقبول احمد استاد فارسی دہلی یونیورسٹی اور ڈاکٹر نور الحسن انصاری
بھی تھے، جناب عابد رضا بیدار صاحب سپرو ہاؤس دہلی سے اپنے بے قرار بلکہ بیدار ذہن کے ساتھ آئے، جامعہ ملیہ کی نمائندگی
مولانا عبدالسلام قدوائی صدر شعبۂ تاریخ اسلام، ڈاکٹر عبدالحلیم خاں صدر شعبۂ عربی اور جناب عبداللطیف اعظمی نے کی،
ادارہ اسلام اور عصر جدید جامعہ نگر دہلی کی طرف سے ڈاکٹر محمود الحسن آئے، دارالمصنفین میزبان تھا، اس لیے اسکی
مجلس انتظامیہ کے اراکین میں اس کانفرنس میں شرکت کے لیے مولانا عبدالماجد دریابادی، نواب عبیدالرحمن خاں
شروانی (علی گڑھ)، مولانا ابوالحسن علی ندوی (لکھنو)، مولانا عمران خاں ندوی (بھوپال)، جناب سعید انصاری
(جامعہ ملیہ) آئے، مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کے ساتھ مولانا رابع ندوی بھی تھے، جو اس وقت ہندوستان
میں عربی کے قابل قدر انشاء پرداز ہیں، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ کی نمائندگی وہاں کے ایک کمسن اور ہونہار
طالبعلم عبدالعظیم نے کی۔ ان مہمانوں کی آمد سے دارالمصنفین اسلامیات کے قدیم وجدید دونوں گروہوں کا ایک سنگم
بن گیا تھا، ان کے قیام وطعام کے اہتمام میں دارالمصنفین کے لوگوں کے ساتھ جناب نیاز احمد صاحب وکیل نائب صدر
مجلس انتظامیہ شبلی کالج، جناب امتیاز احمد صاحب وکیل سکریٹری شبلی کالج، جناب شوکت سلطان صاحب پرنسپل
شبلی کالج، جناب محمد مزمل صاحب سابق وائس پرنسپل شبلی کالج اور کالج کے اساتذہ برابر شریک رہے اور ہر قسم
کا تعاون کیا، جناب عبدالمجید زبیری صاحب صدر شعبۂ سیاسیات تو اہتمام کے سلسلہ میں تین رات جاگتے رہے،
مہمانوں کی پیشوائی کے لیے شاہ گنج اسٹیشن ایک بس پہلے ہی بھیجدی گئی تھی، راستہ میں ان مہمانوں کا
خیر مقدم مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں کیا گیا، اور ان کے اعزاز میں ایک پرتکلف عصرانہ دیا گیا جس میں مدرسہ کے

منتظمین کے ساتھ شاہ غلام خالد رضا وکیل کی خوش سلیقگی کو بھی بڑا دخل تھا، مدرسہ میں مولانا حمید الدین فراہی کے قلم کے تفسیری مسودوں کی نمایش بھی کی گئی تھی، مدرسہ کے ناظم مولانا بدرالدین اصلاحی نے مدرسہ کے مقاصد اور کاموں کا تعارف کرایا، اس کے جواب میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے ایک تقریر کی جو بہت پسند کی گئی، یہ تمام مہمان مغرب کے بعد دارالمصنفین پہنچے، یہاں کی عمارتیں بہت سادہ ہیں لیکن کشادہ مقام واقع ہیں، گل مہر شمشاد، املتاس، آم کے درختوں اور پھولوں کے چمن سے گھری ہوئی ہیں اور صاف ستھری رکھی جاتی ہیں، اس لیے بیرونی مہمانوں کو بھلی معلوم ہوئیں، ڈاکٹر مقبول احمد پروفیسر عطاء الرحمن اور پروفیسر سید حسن نے انکی تعریف کی تو میں نے ان سے کہا کہ آپ لوگ چونکہ اپنائیت کے جذبے سے ان کو دیکھ رہے ہیں اسی لیے بھلی معلوم ہو رہی ہیں ورنہ یونیورسٹیوں کی عمارتوں کے مقابلہ میں ان کی کیا حیثیت ہے،

۳۰ دسمبر کی صبح سے کانفرنس کی کارروائی شروع ہوگئی، مہمانوں نے فجر کی نماز کے بعد مولانا شبلی اور اس احاطہ کے دوسرے آسودگانِ خاک مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کے مزار پر فاتحہ پڑھی، نو بجے جناب حکیم عبدالحمید صاحب نے دارالمصنفین کی علمی نمایش کا افتتاح کیا، اس میں مولانا شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی مطبوعہ تصانیف کے مسودے، تقریباً چار سو مخطوطات، مشاہیر کے خطوط، مولانا شبلی کے لکڑی کا ایک پاؤں، ان کے کچھ کپڑے، اور مولانا سید سلیمان ندوی کی میز پر ان کے دوات و قلم بھی رکھے ہوئے تھے، مہمانوں نے سرسید، اکبر الہ آبادی، عماد الملک، عبدالحلیم شرر، ڈاکٹر اقبال، نادر شاہ بادشاہ افغانستان، گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے خطوط کو بہت دلچسپی سے دیکھے لیکن زیادہ جمگھٹا مولانا شبلی کی سیرۃ النبی، شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر، مضامین عالمگیر کے مسودوں کے پاس رہا، ان کی مشہور تصنیف سیرۃ النبی کے پہلے حصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا ذکر مبارک ظہور قدسی کے عنوان سے ہے، جس میں ان کی

انشا پردازی کا پورا جوہر دکھائی دیتا ہے، اور یہ بہت سے لوگوں کو زبانی یاد ہے، اس کو لکھتے وقت انھوں نے اپنے مسودہ میں جو کاٹ چھانٹ کی تھی، وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا، انھوں نے پہلے اس کی سرخی "شہنشاہ دو عالم کا کوکبۂ ورود" رکھی تھی، پھر اس کو بدل کر "شہنشاہ کونین کا اقبالِ ورود" کر دیا، اس کو بھی بدل دیا اور صرف ولادت سرخی رکھی، لیکن آخر میں ولادت کو بدل کر "ظہور قدسی" کر دیا، اس کے تحت جو کچھ لکھا ہے، اس میں بہت حک و اصلاح کی ہے، جس کے بعد ایک کاتب سے اس کا مسودہ صاف کرایا ہے، اور اس میں پہلے یہ عبارت تھی:-

"چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں، مشاطۂ بہار نے گاہ گاہ شاہدانِ چمن کو اس رعنائی سے آراستہ کیا ہے کہ کشورکشا یانِ جمال نے ذوق تماشا کی نذریں پیش کی ہیں، عروج اقبال کا کوکب بلند، کبھی اس قدر اونچا ہو گیا ہے کہ اجرامِ فلکی اس کے سامنے ذرے بن کر رہ گئے ہیں، سعادت کا ابر کرم کبھی کبھی اس فیاضی دلی سے برسا ہے کہ ایک ایک خار و خس خیر و برکت کا سنبلستان بن گیا ہے، عدل و انصاف کی حکومت کبھی کبھی اس قدر وسیع ہوگئی ہے کہ دنیا کا ایک ذرہ اس کی عالمگیری سے بے اثر نہیں رہا، خرابۂ عالم جو نظر اٹھا کر دیکھنے کے بھی قابل نہیں، اس میں کبھی کبھی مہمان نوازی ابراہیم، صبر ایوب، جمال یوسف، معجز طرازی موسیٰ، جاں نوازی مسیح، اقبال سکندر، شوکت جم اور اوج کیخسرو کے حیرت انگیز مناظر دکھائے ہیں۔

لیکن ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سالِ دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے تھے، سیارگانِ فلک اسی دن کے انتظار میں ہمہ تن چشم براہ تھے، پیر گردوں مدت ہائے دراز سے اسی صبحِ جاں نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا،

کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالمِ قدس کے انفاسِ پاک، اخلاقِ انسانی کے مدارج عروج سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارزِ شاہنشاہِ کونینؐ کے دربار میں کام آئیں گے۔"

مولانا نے آخری نظرثانی میں مندرجۂ بالا عبارت کی بہت سی سطریں نکال دی ہیں، حالانکہ وہ بھی انشاء پردازی کے نمونے اور سچے جذبات کے اعلیٰ مظاہر تھے۔ پھر بھی انھوں نے اپنے اعلیٰ ذوق سے کام لیکر آخر میں جو سطریں چھپنے کے لیے دیں وہ یہ ہیں۔ ناظرین خود ملالیں کہ دونوں میں کیا فرق پیدا ہوگیا ہے۔

"چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سر و سامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہوکر رہ گئی ہیں، لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سالِ دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے، سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخِ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبحِ جاں نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیم، جمال یوسفؑ، معجز طرازی موسیٰ، جاں نوازی مسیح سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارزِ شاہنشاہِ کونینؐ کے دربار میں کام آئیں گے۔"

مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرتِ عائشہؓ، خیام اور حیات شبلی کے سودوں سے زیادہ دلچسپی لی گئی، مولانا عبدالسلام ندوی کی شعر الہند کے سودے کو بھی غور سے دیکھا گیا، ایک دوسری

میز پر دار المصنفین کی ۱۳۸ مطبوعات اور معارف کی ۱۰۴ جلدیں رکھی ہوئی تھیں، اسی پر سیرۃ النبی کے ترکی، پشتو، فارسی اور تامل ترجمے، الفاروق اور شعر العجم کے فارسی ترجمے اور سیرۃ عائشہؓ کے فارسی اور ترکی ترجمے بھی تھے، وہ کتابیں بھی تھیں جن پر ہندوستانی اکیڈمی، ساہتیہ اکیڈمی اور یوپی کی حکومت کی طرف سے انعام ملے ہیں، ایسی کتابوں کی تعداد سات تھی، دوسرے کمرہ میں فارسی اور عربی کے تقریباً چار سو مخطوطات میز پر سجائے گئے تھے، جن میں حسب ذیل نوادر خاص طور پر دیکھے گئے۔

(۱) مونس الارواح مصنفہ جہاں آرا بیگم بنت شاہجہاں، مکتوبہ سنہ ۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۷ء، یہ مطلا اور مذہب نسخہ شہزادی کے مطالعۂ خاص میں رہا (۲) اپنشد جلد اول و دوم مصنفہ داراشکوہ، مکتوبہ سنہ ۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۶ء یہ نسخہ داراشکوہ کے پاس رہا (۳) انیس الحجاج از معین صفی بن ولی قزوینی، یہ شہزادی زیب النساء کے استاد کا سفر نامۂ حج ہے، یہ نسخہ مصور اور عالمگیر کے عہد کا ہے، اس سے اس دور کی مصوری کے نمونوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے، (۴) اکبر نامہ از ابوالفضل، اس مصور نسخہ میں مغلوں کی مصوری کے آرٹ کے بہت عمدہ نمونے ملتے ہیں، اس میں کتابت کا سنہ نہیں درج ہے، اہلِ نظر کی رائے میں اختلاف ہوگیا ہے، کوئی کہتا ہے کہ اس کی مصوری جہانگیری عہد کی ہے، اور کوئی اس نسخہ کو محمد شاہی عہد کا بتاتا ہے، (۵) کلیات کلیم مکتوبہ سنہ ۱۰۷۷ھ / ۱۶۶۶ء بڑا خوشخط نسخہ ہے، شاید ابو طالب کلیم کے ذاتی استعمال میں رہا، (۶) فرہنگ جہانگیری از جمال الدین حسین انجو، اس پر عالمگیری عہد کے امیر لطف اللہ بن سعد اللہ کی مہر ثبت ہے، اور سنہ ۱۰۷۲ھ مرقوم ہے، (۷) مؤید الفضلا از محمد بن لاد دہلوی، یہ دسویں صدی ہجری کی تصنیف ہے لیکن نسخہ بارہویں صدی کا ہے، (۸) فقہ بابری از نور الدین بن قطب الدین مکتوبہ گیارہویں صدی ہجری، یہ نسخہ غیر مطبوعہ ہے، اور ہندوستان میں اس کے شاید دو تین ہی نسخے ہیں، (۹) مرأۃ العالم از بختاور خاں مصنف عالمگیر کے امراء میں سے تھا، یہ نسخہ مصنف

کے قریب عہد کا ہے، (۹) رسالہ حق نما از دارا شکوہ، اس پر کتابت کا سال درج نہیں، (۱۰) جوامع الحکایات ولوامع الروایات از محمد سدید الدین عوفی، بڑا ضخیم نسخہ ہے، اس پر بھی کتابت کا سال درج نہیں، لیکن شان خط سے اس کی قدامت کا اظہار ہوتا ہے، (۱۱) حکایات سلطان محمود غزنوی، مصنف کا نام اور سال کتابت درج نہیں، (۱۲) تذکرہ مخزن الغرائب از احمد علی ہاشمی، سندیلوی مکتوبہ سنہ ۱۲۲۰ھ (۱۳) شرح نہج البلاغہ از عزالدین بن عبد الحمید مدائنی المتوفی سنہ ۶۵۵ھ اس پر شاہان گولکنڈہ کی مہریں ہیں، (۱۴) تفسیر مواہب از ملا حسین واعظ کاشفی المتوفی سنہ ۹۱۰ھ یہ نسخہ سنہ ۹۴۶ھ میں یعنی مصنف کی وفات کے صرف ۳۶ سال بعد لکھا گیا، بہت عمدہ کتابت کا نمونہ ہے، (۱۵) کتاب الجمل از ابو القاسم عبد الرحمن زجاجی نحوی المتوفی سنہ ۳۳۹ء مکتوبہ سنہ ۷۰۱ھ یہ دار المصنفین کے مخطوطات کے ذخیرے کا قدیم ترین نسخہ ہے،

ٹھیک گیارہ بجے کانفرنس کا پہلا اجلاس شبلی کالج کے کانووکیشن ہال میں شروع ہوا، جو حاضرین سے پُر تھا، مولانا ضیاء الحق ندوی ناظر کتب خانہ دار المصنفین نے تلاوت کلام پاک کی، اس کے بعد جناب شاہ معین الدین احمد ندوی نے اپنا خطبۂ استقبالیہ پڑھا، جو معارف کے ناظرین کی نظر سے گذشتہ مہینہ گذر چکا ہے، جناب شاہ صاحب نے اپنے مختصر خطبہ میں بہت سی باتیں قصداً چھوڑ دی ہیں، تاکہ یہ خطبۂ صدارت کے برابر نہ ہونے پائے، پھر بھی عام طور سے پسند کیا گیا،

خطبۂ استقبالیہ کے بعد مولانا ابو الحسن علی ندوی نے اجلاس کا افتتاح کیا، وہ اس وقت اپنی غیر معمولی ذہنی بصیرت اور فکری و نظری گہرائی کی وجہ سے اسلامی دنیا کی ممتاز ترین شخصیتوں میں شمار کئے جاتے ہیں، اور وہاں کے اہلِ ذوق اُن کو بہترین خطیب بھی سمجھتے ہیں، جلسہ میں قدیم و جدید اہل علم کا بڑا اچھا اجتماع تھا، مولانا نے اُن کو مخاطب کرکے ایک بڑی دلنشین تقریر کی جس کا خلاصہ یہ ہے:-

"آٹھویں صدی کے بعد علمی و فکری اعتبار سے عالم اسلام پر ایک اضمحلال سا طاری ہوگیا، اس دور میں دماغ تھکے تھکے اور دل بجھے بجھے نظر آتے ہیں، فن کاروں میں کوئی جدت، اچھوتا پن، اور مصنف میں کوئی نیا خیال یا ابداع یا ابتکار عام طور سے نظر نہیں آتا، مقدمہ ابن خلدون کے علاوہ کوئی ایسی تصنیف نہیں ملتی جس میں اجتہادی شان ہو، اور جدتِ فکر اور ندرتِ خیال نمایاں ہو، ہاں حدیث کا فن جو اس وقت کے مسلمانوں کا محبوب ترین موضوع تھا، اس سے مستثنیٰ ہے، اس فن میں فتح الباری جیسی عظیم ترین تصنیف اسی دور کی ہے، اس صدی میں یہ اضمحلال کیوں طاری رہا، اس پر بھی کام کرنے کی ضرورت ہے، ہندوستان میں آٹھویں صدی کے بعد کچھ ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں، جن کے یہاں جدتِ فکر بلکہ جراتِ اندیشہ پائی جاتی ہے ملا محمود جونپوری، شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ اسماعیل شہید اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے یہاں نئے مضامین ملتے ہیں، اور جہاں تک معارف و حقائق عمیق و دقیق علوم، اور لطیف مضامین کا تعلق ہے الشیخ شرف الدین یحییٰ منیری، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے مکتوبات کی نظیر پورے اسلامی کتب خانہ میں نہیں ملتی، ہندوستانی علماء کی یہ جرأت قابلِ داد ہے، کہ انھوں نے عربی لغت میں بھی اپنی قابلیت اور اپنے تفوق کا ثبوت دیا، عربی معاجم کے ابتدائی ماخذ میں العباب الزاخر بھی ہے، جو ایک ہندی علامہ صغانی لاہوری کی تصنیف ہے، علامہ مرتضیٰ بلگرامی الملقب بہ زبیدی نے عربی کی مشہور اور مستند لغت القاموس کی شرح تاج العروس کے نام سے دس جلدوں میں لکھی جو پانچ ہزار صفحات پر مشتمل ہے، علوم بلاغت میں ملا محمود جونپوری کی کتاب الفرائد اور آخر میں

مولانا حمید الدین فراہی کی کتاب جمہرۃ البلاغۃ میں نئے خیالات ملتے ہیں، اور مجتہدانہ فکر نظر آتا ہے، جسٹس کرامت حسین کی کتاب فقہ اللسان ادبائے عرب کی نگاہ میں بھی وقعت رکھتی ہے، ہندوستان میں ایک آدمی نے وہ کام کیا ہے جو یورپ میں پوری اکیڈمی کرتی ہے، معجم المصنفین ایک فرد واحد مولانا محمود حسن خاں ٹونکی کا عظیم تصنیفی کارنامہ ہے، یہ ساٹھ جلدوں میں اور بیس ہزار صفحات پر مشتمل ہے، اور اس میں چالیس ہزار اشخاص کا تذکرہ ہے، اسلام اسلامیات سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اس موضوع کے ساتھ اس وقت تک انصاف نہیں کیا جا سکتا جب تک اس کے سرچشمہ کو نہ سمجھ لیا جائے، اور اس سے کسی درجہ میں تعلق نہ ہو، جس سے اسلامیات کی ابتدا ہوئی ہے، اور جس سے اس موضوع میں معنویت قدر و قیمت، اور آفاقیت پیدا ہوتی ہے، اور اسی نسبت اور تعلق کی بنا پر یہ ساری دنیا کا مرکز توجہ بن گیا ہے، یہاں تک کہ مستشرقین کو بھی اس پر اپنی توجہ مرکوز کرنی پڑی، میری مراد اس محبوب اور عہد آفرین شخصیت سے ہے جس کا نام نامی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔

هزار بار بشویم دهن ز مشک و گلاب | هنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

اسلامیات پر کوئی مؤثر تصنیف اس وقت تک نہیں لکھی جا سکتی جب تک کہ اسلامیات کے اصل سرچشمہ سے کسی حد تک اعتقادی، اور کسی درجہ میں جذباتی تعلق نہ ہو، اور وہ کیفیات طاری نہ ہو جائیں، جو ایک عقیدہ اور جذبہ رکھنے والے انسان پر طاری ہوتی ہیں، اگر یہ نہیں تو سب کاغذی پھول ہوں گے،

.. .. فکر و نظر، تحقیق اور جستجوئے حکمت

اور بے معنی ہے، اگر حقیقت کا ادراک نہ ہو، اور ان علمی کاوشوں میں زندگی کا کوئی پیغام نہ ہو، اقبال نے کہا ہے،

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن | جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو | جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

اقبال ہی کا یہ شعر بھی ہے،

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر | نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

مولانا کی تقریر بڑے غور سے سُنی گئی، اور بہت پسند کی گئی،

اس کے بعد حکیم عبد الحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ نے اپنا صدارتی خطبہ پڑھا، جو معارف کی اسی اشاعت میں درج کیا جا رہا ہے، حکیم صاحب موصوف کے اس خطبہ سے اندازہ ہوا کہ وہ نہ صرف طب میں کامل مہارت رکھتے ہیں، بلکہ علمی نظر و فکر کے بھی حامل ہیں، اور علمی مجلس کو اپنے مفید مشوروں سے نواز سکتے ہیں،

اس خطبہ کے بعد کانفرنس کے سکریٹری ڈاکٹر مقبول احمد نے اس کی زبانی رپورٹ پیش کی، جس میں کانفرنس کے اغراض و مقاصد اور اس کی تاریخ بتائی، اور پھر مولانا ابو الحسن علی ندوی کو اطمینان دلایا، کہ انھوں نے جس حقیقت کے ادراک کی طرف توجہ دلائی ہے اس سے کانفرنس کے نمایندوں میں کم و بیش وابستگی ضرور پائی جاتی ہے،

میں خود میزبان کی حیثیت سے کانفرنس کے شاندار اجتماع سے محظوظ ہو رہا تھا، اس کی کارروائی کے درمیان سوچ رہا تھا، کہ دار المصنفین کی دعوت پر ہندوستان کے اسلامیات کے تمام سیارے اس وقت یہاں آکر جمع ہو گئے ہیں، ان میں کوئی آفتاب ہے تو کوئی ماہتاب، کوئی عطارد ہے تو کوئی مشتری، ہر میں متاثر ہو کر اس وقت اعظم گڈھ کی فضا، کو بہت ہی رنگین حسین اور بہار آفریں

پا رہا تھا، مجھ کو خیال آیا کہ استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی فرمایا کرتے تھے کہ "اعظم گڈھ جیسے
دور افتادہ شہر کے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے جو بھی دارالمصنفین آتا ہے، اس کو محبت کا مجسمہ اور
اخلاص کا پیکر سمجھنا چاہئے"، اس خیال کے آتے ہی میرا بس چلتا تو محبت کے ان مجسموں، اور
اخلاص کے ان پیکروں کے گلے میں دارالمصنفین کی طرف سے بھی محبت اور اخلاص کا مرصع نگار
ینا کار نولکھا ہار پہناتا، اور جب میں اُن کا شکریہ ادا کرنے کو اٹھا تو جذبات سے کچھ ایسا مغلوب
تھا کہ میں یہ سب کچھ کہنا چاہتا تھا معلوم نہیں میری قوت گویائی میرے جذبات کا ساتھ دے
سکی یا نہیں، شاید نہیں،

اسی روز ۳ بجے مقالہ خوانی کا اجلاس حکیم عبدالحمید صاحب کی صدارت میں شروع ہوا،
وکل سکریٹری کی حیثیت سے مجھ ہی کو جلسہ کی کارروائی کنڈکٹ کرنے کو کہا گیا، کانفرنس کے لئے
۴۳ مقالات وصول ہوئے تھے، پہلی نشست میں پانچ مقالات پڑھے گئے، جن میں تین تو انگریزی
اور دو اردو میں تھے، اُن کے عنوانات یہ تھے، (۱) ہندوستان کی اسلامی تعلیمات کے موجودہ
رجحانات (انگریزی) از ڈاکٹر جی۔ آر۔ عبداللہ، کشمیر یونیورسٹی، (۲) سید محمد گیسو دراز
اور وحدت الوجود (انگریزی) از ڈاکٹر سید وحید اشرف، شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی، (۳)
شیخ محمد عبدہ کے تعلیمی افکار (اردو) از جناب محمد راشد صاحب ندوی شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی
(۴) ذاکر حسین، شخصیت و افکار (اردو) از جناب عابد رضا بیدار صاحب دہلی، (۵) اسلام اور
سائنس، (انگریزی) از ڈاکٹر محمد مظفر گڈھ یونیورسٹی ڈاکٹر جی۔ آر عبداللہ اپنا مقالہ پڑھتے وقت
کہہ گئے کہ سرسید نے جس طرح سیاست میں انگریزوں سے وفاداری کی تعلیم دی، اسی طرح مسلم یونیورسٹی
کی طرز تعلیم میں بھی یہی وفاداری کا رنگ پیدا کیا، لیکن دیوبند کے طرز تعلیم میں یہ وفاداری کا رنگ
نہیں پایا جاتا، جس کو سن کر علی گڈھ کا پورا گروپ بپھر اٹھا، جس کے بعد مقالہ نگار کو اُن کے زد

سے نکلنا مشکل ہوگیا، عابد رضا بیدار صاحب اپنا مقالہ اسلامی ممالک کے موجودہ رجحانات پر لائے تھے، مگر
معلوم نہیں کیوں اس کے بجائے اپنی ایک مطبوعہ کتاب کا کچھ حصہ پڑھ کر سنانے لگے، جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین
مرحوم پر بہت کچھ چھینٹے تھے، جامعہ ملیہ کے جناب سعید انصاری نے آزردہ ہو کر صدر سے کہا کہ ایسے
مقالے اس مجلس میں نہ پڑھے جائیں، اور مقالات دلچسپی سے سنے گئے،

اس نشست کے بعد تمام نمائندے بلریا گنج کے مدرسۃ جامعۃ الفلاح میں ایک پرتکلف چائے پر
مدعو تھے، یہ چھوٹا سا قصبہ اعظم گڈھ سے آٹھ میل دور ہے، وہاں بھی مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ایک تقریر
ہوئی، واپسی کے بعد مقالہ خوانی کی دوسری نشست ہوئی، جو آٹھ بجے رات تک جاری رہی، اس کی
صدارت پروفیسر عطاء الرحمن کاکوی نے کی، جس میں حسب ذیل مقالات پڑھے گئے، (۱) تاریخ بنگالہ
فارسی کی ایک غیر مطبوعہ تاریخ (انگریزی) ڈاکٹر عطا کریم برق، (۲) ریاض الافکار (فارسی نثر
نگاروں کا ایک تذکرہ) از ڈاکٹر نور الحسن انصاری (۳) مولانا کرامت علی جونپوری از حافظ مجیب اللہ
ندوی، (۴) آل بویہ کی فوجی جاگیرداری کا مطالعہ (انگریزی) ڈاکٹر سید محمد صابر خاں (۵)
ریاض حسن خاں خیال از سید علی حیدر نیر، (۶) دارا شکوہ کی ایک نئی تصنیف از پروفیسر عبدالقادر
سروری (۷)، علامہ شبلی کے دو خواب از عبداللطیف اعظمی (۸) عربی غزل از ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی،
(۹) فرقہ اسماعیلیہ کے مبلغ، شاعر و مصنف ناصر خسرو کے سفرنامہ کا پہلا فارسی مقدمہ از پروفیسر
سید حسن، یہ آخری مقالہ جدید فارسی میں لکھا گیا تھا، جس کو سن کر جناب شاہ معین الدین احمد صاحب
ندوی ناظم دارالمصنفین نے فرمایا مسرت ہے کہ ہندوستان میں ایسے لوگ موجود ہیں، جو ایسی عمدہ
فارسی لکھ لیتے ہیں،

ڈاکٹر نور الحسن انصاری نے اپنے مضمون میں جہانگیری دور کے امیر مہابت خان کے کچھ خطوط کے ایسے
ٹکڑے سنائے، جو اُس نے ملکہ نورجہاں کو لکھے تھے، ان میں نورجہاں کو صیغۂ واحد حاضر میں مخاطب کیا

گیا ہے، یہ مغلوں کے عہد کی مکتوب نگاری کے آداب کے خلاف ہے، اس لئے ان مکاتیب کے متعلق
شبہات پیدا ہوئے، پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنے مقالہ میں دارا شکوہ کے کچھ ایسے سادہ اور
سلیس اردو اشعار سنائے کہ کچھ لوگوں کو خیال ہوا کہ یہ اشعار دارا شکوہ کے نہیں، بلکہ اس کی طرف منسوب
کر دیئے گئے ہیں، اس لئے اس کی تصنیف کے متعلق بھی شکوک پیدا ہوئے، جناب عبداللطیف اعظمی
صاحب نے اپنے مختصر مقالہ میں یہ بتایا کہ مولانا شبلی کے دو خواب میں ایک خواب یہ تھا کہ ایسے علماء تیار
کئے جائیں، جو قدیم و جدید دونوں کے تقاضوں اور مطالبوں سے واقف ہوں، اور ان کو پورا کرنے
کی صلاحیت رکھتے ہوں، ان کا دوسرا خواب یہ تھا کہ تاریخ اسلام از سر نو سائنٹفک طریقہ سے
مرتب کی جائے، مقالہ نگار نے ان دونوں مقاصد کی تکمیل کے سلسلہ میں دار المصنفین اور ندوۃ العلماء
کی کوششوں کا اعتراف کیا، لیکن ان دونوں کاموں کو اور بڑھانے پر زور دیا، جناب عبدالحلیم
ندوی صاحب نے اپنے مقالہ میں عربی غزلوں کے کچھ ایسے اشعار سنائے، جو فاسقانہ رنگ کے تھے،
اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ عربی غزلوں میں اسی قسم کا سرمایہ ہے، وہ عربی غزلوں کے دوسرے
رنگ کے اشعار بھی سناتے، تو یہ غلط فہمی دور ہو جاتی،

مقالہ خوانی کی اس نشست کے بعد دار المصنفین کی طرف سے ایک پر تکلف ڈنر بھی تھا
جس میں نمائندوں کے علاوہ شہر کے دو سو معززین بھی شریک تھے، ۳۱ر دسمبر کی مقالہ خوانی کی
نشست مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی صدارت میں شروع ہوئی، جو ۹ بجے دن سے شروع ہو کر
۱ بجے ختم ہوئی، بیچ میں آدھ گھنٹہ چائے کے لئے وقفہ ہوا، ان دو نشستوں میں حسب ذیل مقالے
پڑھے گئے، (۱) حیاتی گیلانی، حیاتی کاشی اور تغلق نامہ امیر خسرو از ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی (۲) عربی
کے مدحیہ قصائد از ڈاکٹر بدر الحسن عابدی (۳) تقسیم کے بعد ہندوستان میں مسلم اقلیت کا سیاسی رجحان
از جناب خلاق احمد صاحب (۴) اسلام کا معروضی مطالعہ از مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۵) تذکرہ علمائے

پھلواری شریف، از شاہ عون الدین ندوی (۶) اسلام میں ایشیائی عظمت و شرف از جناب شاہ معین الدین احمد
ندوی (۷) فتوی نویسی میں عصری تقاضوں کا مقام از ڈاکٹر بشیر الحق (۸) احیاء الخلافة العباسیة بالقاہرۃ
(عربی) از جناب سعود الرحمن خاں ندوی (۹) تامل ناڈ کے مذہبی لٹریچر پر ایک تبصرہ، از جناب محمد یوسف کوکن
صاحب (۱۰) فقہ میں ابن رشد کا مقام از عبدالعظیم اصلاحی (۱۱) اجتہاد کے سماجی عوامل از جناب فضل الرحمن
صاحب (۱۲) مولانا وکیل احمد جونپوری، از مفتی رضا انصاری (۱۳) پندرھویں صدی عیسوی میں عرب علم
سائنس اور معاشرہ (۱۴) ابن اثیر مورخ کی حیثیت سے از ڈاکٹر محمود الحسن (۱۵) علامہ محدث ابن حبان
از جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب (۱۶) اہمیت رکھنے والے مقالات جن کے ناموں میں تبدیلی ہو گئی ہے،
از جناب محمد رابع ندوی صاحب (۱۷) بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں اسلامیات کا مطالعہ (انگریزی)
از محمد عبدالسبحان،

یہ تمام مقالات بڑی دلچسپی سے سنے گئے، اور ان پر سوال و جواب بھی ہوتے رہے، مولانا سعید احمد
اکبر آبادی نے اپنا مقالہ "اسلام کا معروضی مطالعہ" خطیبانہ انداز میں پڑھا، جس سے اثر پیدا ہوا، لیکن انھوں
نے ایک جگہ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کی جو تفسیر بتائی، اس سے کچھ اختلاف پیدا ہو گیا، ان کا خیال ہے کہ
اس آیت سے خداوند تعالیٰ کی آزردگی ظاہر ہوتی ہے، ... ...
... اور اسی حالت میں فرمایا کہ جاؤ تم کو تمہارا دین مبارک ہو اور ہم کو ہمارا دین، لیکن مولانا سجاد حسین اور
جناب بدر الحسن نے اس سے اتفاق نہیں کیا، اسی طرح انھوں نے یہ فرمایا کہ ہندوستان میں اسلام آیا تو
جن چیزوں سے اس کو نقصان پہونچا، ان میں ایک تصوف بھی ہے، اس پر کچھ لوگ معترض ہوئے، مولانا نے
بڑی فراخدلی سے فرمایا کہ اگر اس سے اختلاف ہے، تو میں اس رائے میں ترمیم کرنے کے لئے تیار ہوں، لیکن انھوں نے
عجمی افکار سے آزاد ہو کر قرآن پاک کے مطالعہ پر زور دیا، جناب فضل الرحمن صاحب نے اپنے مقالہ میں اجتہاد کے
لئے یہ شرطیں لازمی قرار دیئے (۱) انسانی سماج کی تغیر پذیری (۲) تغیرات کا اعتراف (۳) بنیادی

اصولوں کا وجود (۴) اصولوں سے رہنمائی حاصل کرنے کی خواہش، انھوں نے اپنے اسی مقالہ میں اجتہاد کی حسب ذیل رکاوٹوں کی طرف ذہن منتقل کرایا، (۱) الحاد (۲) اباحیت (۳) مداہنت اور نااہلیت، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اسلام کی بقا اجتہاد پر ہے لیکن اجتہاد کے لئے جس ڈھانچہ کی ضرورت ہے وہ اس وقت موجود نہیں، سماجی ڈھانچہ کو بدلنے کی ضرورت ہے، مقالہ خوانی کے بیچ درمیان ہندو یونیورسٹی کے جناب سید سلیمان عباس صاحب نے ایک دلچسپ تقریر کی جس میں ان کے بعض فقروں سے سامعین بہت محظوظ ہوئے، انھوں نے ایک جگہ کہا کہ آج کل کے محققین اسکی تلاش و جستجو میں تو ضرور لگے رہتے تھے کہ ملا صدرا کے بول و براز کی کونسی جگہ تھی لیکن ملا صدرا نے کیا پیش کیا اس سے وہ بالکل بے خبر ہوتے ہیں، ڈاکٹر مشیر الحق ندوی کا مقالہ دلچسپی سے سنا گیا، انھوں نے عہد جدید میں فتویٰ نویسی کے ضروری شرائط کی نشاندہی کی، انھوں نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے فتووں کی مثالوں سے ثابت کیا کہ مفتی کے لئے زمانہ کی معاشی اور سماجی ضرورتوں اور تقاضوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، اس مضمون میں بعض جگہ جو طنز سے کام لیا گیا تھا، وہ نہ ہوتا تو اچھا تھا، مولانا شاہ معین الدین ندوی نے اپنے مقالہ میں یہ بتایا کہ انسان کی عظمت و شہرت اسلام ہی نے قائم کیا، اور یہ انسان کو جس بلند مقام پر لیجاتا ہے، اس کی مثال دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی اور یہ ایسی حقیقت ہے جو زمان و مکان کی قید سے باہر ہے، مولانا محمد رابع ندوی نے بعض ان مقامات کی نشاندہی کی جن کے نام سیرت نبوی کے واقعات میں بار بار آتے ہیں لیکن وہ اب دوسرے ناموں سے مشہور ہیں، اس مضمون سے بھی دلچسپی لی گئی،

جو مقالات وقت کی قلت کی وجہ سے نہ پڑھے جا سکے، وہ یہ ہیں، (۱) عربوں کی تمدنی تاریخ کے اہم ماخذ از شاہ معین الدین احمد ندوی (۲) ہندوستان میں وحدت الوجود سے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ، غالب کی فارسی شاعری ہندوستان اور ایران کے نقادوں کی نظر میں، از سید صباح الدین عبدالرحمن (۴) مجد الدین محمد بن یعقوب فیروزی از مولانا عبدالسلام قدوائی،

جو مقالات موصول ہوئے لیکن مقالہ نگار خود نہ آسکے، ان کے نام یہ ہیں (۱) احادیث کے [illegible]

از ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کلکتہ (۲) ابن خلدون کا تنقیدی نظریہ، از سید احتشام احمد ندوی، ونکٹیشور یونیورسٹی، (۳) وسط ایشیا کا ترکی لٹریچر، از ڈاکٹر اکمل ایوبی مسلم یونیورسٹی، (۴) اسلام میں انسان کا تخیل، از ڈاکٹر عبدالحق انصاری شانتی نکیتن (۵) موجودہ دور کے مسلمانوں کے نصب العین کی فروگذاشتیں، از جناب عبدالعلی صاحب، حیدر آباد، (۶) شاہان مغلیہ کا ذوق علمی، از ڈاکٹر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی (۷) مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور انکی فرحۃ المدرسین، از ڈاکٹر عبدالعلیم خاں شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی (۸) اسلام میں خلافت کا نظام اور خلافت راشدہ، از جناب سید ریاست علی ندوی صاحب، گیا، (۹) مذہب اور سیاست سے متعلق اسلامی نظریہ اور عمل از پروفیسر ایم۔ ایس۔ اگوانی، دہلی،

مقالہ خوانی کے جلسوں کی خاص بات یہ تھی کہ جس کمرہ میں یہ مقالے پڑھے گئے، وہ ہر وقت بھرا رہا، بہت سے سامعین کو باہر کھڑا رہنا پڑا، ان کو مقالوں سے ایسی دلچسپی رہی کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی ہر مقالہ پر کوئی دلچسپ فقرہ ضرور کہتا جس سے مقالہ خوانی کی خشکی جاتی رہی،

مقالہ خوانی کے بعد کانفرنس کے نمائندوں کا ایک مخصوص جلسہ ہوا جس میں حسب ذیل دانشوروں اور عالموں کی وفات پر تعزیتی تجویزیں منظور ہوئیں، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر ہمایوں کبیر، ڈاکٹر محمد نظام الدین، ڈاکٹر محمد اسحاق، پروفیسر اجمل خاں، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، مولانا رئیس احمد جعفری ندوی، (پاکستان) پروفیسر پوداؤد (ایران) پروفیسر صورت گر (ایران) پروفیسر اے جے آربری (انگلستان) پروفیسر جوزف شاخت،

آئندہ دو سال کے لئے کانفرنس کی حسب ذیل جدید مجلس عاملہ کا انتخاب ہوا، (۱) ڈاکٹر عبدالعلیم وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی صدر، (۲) شاہ معین الدین احمد ندوی، ناظم دارالمصنفین، نائب صدر (۳) ڈاکٹر مقبول احمد مسلم یونیورسٹی، سکریٹری (۴) ڈاکٹر حافظ غلام مصطفیٰ صاحب مسلم یونیورسٹی، جوائنٹ سکریٹری (۵) ڈاکٹر محمد اقبال انصاری (ٹریزرر) ارکین: (۱) سید صباح الدین عبدالرحمن دارالمصنفین (۲)

پروفیسر سید حسن پٹنہ یونیورسٹی، (۳) پروفیسر عطا کریم برق کلکتہ یونیورسٹی، (۴) جناب اوصاف علی (دہلی) (۵) جناب عبد اللطیف السندی الٰہ آباد یونیورسٹی، (۶) جناب عابد رضا بیدار صاحب (دہلی) (۷) مولانا فضل الرحمٰن گنوری مسلم یونیورسٹی (۸) مولانا محمد رابع ندوی (ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مولانا ابو الحسن علی ندوی نے کانفرنس کو آئندہ اجلاس کے لئے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مدعو کیا جو دو سال کے بعد ۱۹۷۲ء میں ہوگا، اس نشست کے بعد ڈاکٹر عبد العلیم صاحب کی ایک تقریر ہوئی جس کے سننے کے لئے تمام لوگ مشتاق تھے، ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں کانفرنس کے اغراض و مقاصد بتاتے ہوئے کہا کہ اسلامی عقائد اور علوم کو پیش کرنے کا ایک طریقہ تو جذباتی اور تبلیغی ہوتا ہے، اس کی افادیت سے انکار نہیں، اس طریقۂ کار کے مواقع آتے رہتے ہیں، اور اس کی بھی ضرورت ہے، دوسرا طریقہ اسلامی عقائد اور علوم کو ٹھنڈے اور غیر جذباتی طور پر پیش کرنا ہے، اس کے بھی مواقع آتے رہتے ہیں، اس کی ضرورت سے بھی اختلاف نہیں، اس کی تفصیل پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ کانفرنس کا بنیادی مقصد اسلامیات کو ٹھنڈے طریقہ سے پیش کرکے دوسروں کو اپنے خیالات سے قریب کرنا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی کہا کہ اسلامیات کو دین سے جدا نہیں کیا جا سکتا، انھوں نے ہندوستانی علماء اور اسلامیات پر ہندوستان میں کئے جانے والے کاموں کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت بھی بتائی، اسلامی علوم کے قدیم طریقۂ تعلیم پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا، اور فرمایا کہ اس میں اصلاحات کی ضرورت ہے لیکن اس کو ایسا ناکارہ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا، اس کا بھی مقام ہے، اور اس کو بھی باقی رہنا چاہئے، ڈاکٹر صاحب کی تقریر کچھ ایسی ٹھنڈی اور غیر جذباتی اور متوازن تھی کہ اس کو تمام لوگوں نے پسند کیا، انہی جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی اور مولانا ابو الحسن علی ندوی بھی تھے،

اس تقریر کے بعد مجھ کو تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کرنا پڑا، میں اس کی مجموعی کامیابی سے کچھ

ایسا متأثر تھا کہ مجھ سے زیادہ کچھ کہا نہ جا سکا لیکن جب کھڑا ہوا تو زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے، شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھ پر وہی کیفیت طاری ہے جو وصال یار کے بعد فراق یار کے وقت ہوا کرتی ہے، یہ تین دن کیسے اچھے گذرے، ہم دار المصنفین والے اپنے مہمانوں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے کہ ع

یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں — جگرؔ

اور ہم دار المصنفین والوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم نے شراب شوق پی لی ہے، جو

اچھل رہی ہے چھلک رہی ہے، پیے ہوئے ہیں پلا رہے ہیں — جگرؔ

دار المصنفین والے اس کانفرنس کی یاد کا ایک قلعۂ معلیٰ بنائیں گے، اور بہت دنوں تک اس میں آباد رہیں گے"

میں نے اپنے مہمانوں کو آخر میں آتشؔ کے ان مصرعوں کے ساتھ الوداع کہا

ع: ہمارے پاس سے جاؤ تو پھر کر دیکھتے جاؤ

اور یہ بھی

ع: تڑپتا ہے تمہارا کشتہ کیونکر دیکھتے جاؤ

آخر میں مولانا سید احمد اکبر آبادی اور ڈاکٹر مقبول احمد نے اراکین دار المصنفین اور کالج کے اساتذہ کا شکریہ ادا کیا، جنھوں نے اُن کے بیان کے مطابق خاطر مدارات، میزبانی اور خدمت گذاری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، ڈاکٹر مقبول احمد تو یہاں تک کہ گئے کہ یہ کانفرنس دار المصنفین کے اجلاس میں [illegible] ہو گئی ہے، کانفرنس کے خاتمہ پر شبلی کالج کی انتظامیہ کمیٹی کی طرف سے ایک شاندار ایٹ ہوم دیا گیا، جس میں مرزا نیاز احمد بیگ وکیل نائب سکریٹری نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا، اس میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے پھر ایک بار تقریر کی، اور فرمایا کہ میں اس کانفرنس کی شرکت

سے بہت مسرور ہوں، میری بہت سی غلط فہمیاں دور ہوگئیں، اور آیندہ اس کی کامیابی کیلئے دعائیں کیں،

کانفرنس کے خاتمہ پر جناب عابد رضا بیدار صاحب کی کوششوں سے ایک مذاکرہ ہوا جس میں مولانا سید احمد اکبرآبادی، ڈاکٹر مقبول احمد، پروفیسر یوسف کوکن، مولانا فضل الرحمٰن گنوری، ڈاکٹر صابر خاں، ڈاکٹر وحید اشرف، حافظ مجیب اللہ ندوی، مولانا محمد رابع ندوی نے حصہ لیا، زیادہ زور اس پر تھا کہ عربی مدارس کا نصاب جامد ہے، اس میں تبدیلی ہونی چاہئے تاکہ وہ زندگی سے مطابقت رکھے، آخر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک مدلل تقریر ہوئی، جس میں انھوں نے فرمایا کہ یہ کہنا کہ عربی نصاب تعلیم جامد رہا ہے، صحیح نہیں، ہر زمانہ میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ہوتی رہیں، اگر اس نصاب سے مفید نتائج برآمد نہیں ہوئے، تو یہ نصاب کا نقص نہیں ہے، بلکہ یہ اس ذہن کی کجی کا نتیجہ ہے جس میں ساری دنیا اس وقت مبتلا ہے، ذہن کی یہی کجی کسی نصاب تعلیم سے استفادہ ہونے نہیں دیتی، خواہ وہ عربی کا قدیم نصاب ہو، یا ترمیم شدہ نصاب ہو یا یورپ کی یونیورسٹیوں کا نصاب ہی کیوں نہ ہو، انھوں نے یہ بھی فرمایا، کہ اس وقت یورپ کی تمام یونیورسٹیوں کا نصاب وہاں کے لوگوں کی زندگی کا ساتھ نہیں دے رہا ہے، اس آخری نکتہ کو انھوں نے کچھ ایسی وضاحت سے بیان کیا کہ تمام مذاکرین نے اس سے اتفاق کیا،

اس کانفرنس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ قدیم اور جدید دونوں طرز فکر کے علما اور دانشور پہلی دفعہ اس کے پنڈال میں جمع ہوئے، قدامت اور جدت میں جو ٹکراؤ ہے اس میں یہاں مفاہمت کی فضا پیدا ہوتی رہی، اسلامیت پر دلچسپی رکھنے والا قدیم گروہ تو دین کے احکام و مسائل اور شریعت کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف ہے لیکن وہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات پر وہ بصیرت نہیں رکھتا، جو رکھنا چاہئے، اسلامیت پر کام کرنے والوں کا ایک دوسرا گروہ دنیا کی رفتار پر اچھی نظر رکھتا ہے، اور اسلام کو ان بدلے ہوئے حالات میں ترقی پذیر دیکھنا چاہتا ہے،

لیکن وہ دین کے احکام اور شریعت کے اسرار سے واقف نہیں اگر یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور دونوں فراخ دلی سے اپنے طرزِ فکر میں مفاہمت بھی پیدا کرتے رہیں تو اسلام کے ابدی حقائق کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے، اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا پلیٹ فارم اس مقصد کی تکمیل کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے، مولانا ابوالحسن علی ندوی کا یہ فرمانا کہ اس کانفرنس کی شرکت سے میری بہت سی غلط فہمیاں دور ہوگئیں، اور ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کا یہ کہنا کہ اسلامیات کو دین سے جدا نہیں کیا جا سکتا، کانفرنس کی آیندہ زندگی کے لئے بشارت ہے کہ اس کے ذریعہ سے بعد المشرقین میں بھی قرآن السعدین ہو سکتا ہے، اس قران السعدین ہی کی طلب کانفرنس کے نمایندوں میں پائی جاتی تھی،

دار المصنفین والے خوش تھے کہ یہ ادارہ کانفرنس کے ذریعہ قدیم و جدید دونوں گروہوں کا ایک سنگم بن گیا تھا،

مطبوعات جدیدہ

قرآن شریف ہندی ترجمہ و تفسیر مترجمہ جناب نند کمار اودتھی صاحب بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت، و طباعت بہتر صفحات ۱۰۳۲ مجلد، مع گرد پوش قیمت ۳۵ روپیہ، پتہ بھون وانی، ۱۰۹، رانی کٹرہ، لکھنؤ نمبر ۳،

ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی میں اسلامی علوم کا ذخیرہ ابھی بہت کم ہے، کچھ لوگوں نے انفرادی حیثیت سے اور خصوصیت سے جماعتِ اسلامی ہند نے اس کی جانب توجہ کی ہے، چند سال پہلے اس کی کوششوں سے قرآن مجید کا ہندی ترجمہ شائع ہوا تھا، اب یہ نیا ہندی ترجمہ ایک ہندو فاضل نند کمار اودتھی صاحب نے کیا ہے، جو اُن کی بیس سالہ محنت و کاوش کا ثمرہ اور تشریحی و تفسیری حواشی سے مزین ہے، ہر سورہ کے شروع میں اُس کی آیات، رکوع، حروف و الفاظ کی تعداد بھی درج ہے، ترجمہ و تشریح کی صحت کے لئے یہ سند کافی ہے کہ اس میں حضرت شاہ عبدالقادر کے ترجمہ سے زیادہ مدد لی گئی ہے، اور تشریحی نوٹوں پر قاری مفتی محمد صدیقی صاحب دارالمبلغین لکھنؤ نے اصلاح و ترمیم اور نظر ثانی کی ہے۔ مترجم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے، کہ انھوں نے قرآن مجید کا عربی متن دیوناگری رسم الخط میں اس طرح تحریر کیا ہے، کہ صحیح عربی تلفظ ٹھیک ادا ہو جائے، اور مزید احتیاط کی ہے کہ اُس کے ساتھ اصل عربی متن عربی رسم خط میں بھی دیدیا ہے، اور وصل، فصل، قلب، ادغام، رکوع، سجدہ اور وقف کی علامتوں کا ذکر، اور ہندی میں عربی لہجہ کے مطابق تلاوت کرنے کے قاعدے، مخارج، ادغام اور وصل فصل کے طریقے بھی تحریر کر دیئے گئے ہیں

لیکن ہندی اتنی صاف اور آسان ہے، کہ اردو کے قریب ہو گئی ہے، اودتھی جی کی یہ عظیم الشان قرآنی خدمت لائق تبریک و تحسین ہے، انھوں نے ہندوؤں کی طرح نئی نسل کے ان مسلمانوں کو بھی اللہ کے کلام اور پیغام سے واقف ہونے کا موقع دیا ہے، جو صرف ہندی سے واقف ہیں، اُمید ہے کہ یہ ترجمہ مقبول ہوگا، اس کی خوبیوں اور مترجم کی محنت و جانفشانی کی صحیح داد ہندی زبان کے ماہرین ہی دے سکتے ہیں،

نوائے عصر از جناب یحییٰ اعظمی صاحب تقطیع خورد کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات قیمت: عہ پتہ:- دارالمصنفین - اعظم گڈھ

جناب یحییٰ اعظمی دبستان شبلی و سہیل کے مشہور خوش فکر و خوشگو شاعر ہیں، اُن کے کلام کا ایک مجموعہ اس سے پہلے نوائے حیات کے نام سے شائع ہو چکا ہے، یہ ان کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے، اُن کو اپنے استاذ مولانا سہیل مرحوم کی طرح نظموں سے زیادہ مناسبت ہے، یہ مجموعہ منظومات ہی پر مشتمل ہے، اس میں آزادی کے بعد کے حالات و رجحانات کی عکاسی اور نئے ہندوستان کے عظیم الشان تعمیری و فلاحی منصوبوں، درخشاں مستقبل، شان و شکوہ اور اُس کی ممتاز و مایہ ناز شخصیتوں کی عظمت اور اُن کے کارناموں کا ولولہ انگیز انداز میں ذکر کیا گیا ہے، انھوں نے علم و ادب اور سیاست کے بعض مشاہیر کے مرثیے بھی کہے ہیں، جو شدت تاثر اور جوشِ عقیدت سے معمور ہونے کے علاوہ نوجوانوں کے لئے درس و پیام بھی ہیں، یہ پورا مجموعہ ستھرے ذوق، گہرے مشاہدے، قوتِ تخیل، طرزِ ادا کی لطافت، مشق سخن اور پختگیِ کلام کا دلکش نمونہ اور اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

غالبؔ کی کہانی مرتبہ جناب شفیع الدین نیر صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۱۲۸، قیمت: -/۲ پتہ:- نیر کتاب گھر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

غالب پر بہت لکھا جا چکا ہے، لیکن بچوں کے لائق کوئی کتاب نہیں ہے، مرحوم صدر جمہوریہ ڈاکٹر

ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم کے ایما سے جن کو بچوں کے ادب و لٹریچر سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے، جامعہ کے پہلے استاذ اور بچوں کے مشہور و محبوب شاعر و ادیب جناب شفیع الدین نیر نے یہ دلچسپ کتاب لکھی ہے، اس میں غالب کے خاندانی حالات، پیدائش سے وفات تک کے واقعات، اخلاق و عادات، شاعرانہ کمالات، انشا پردازی اور خطوط نگاری کا مختصر مگر جامع طور سے تذکرہ کیا گیا ہے، غالب کی کہانی مرتب کرنے میں بچوں کے ذوق و استعداد کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، زبان سادہ اور عام فہم، پیرایہ دلکش اور دلچسپ، اور انداز سلیس و شگفتہ ہے، نیر صاحب کا نام ہی اس کی خوبی کی پوری ضمانت ہے، اور غالباً اس خدمت کا اُن سے زیادہ بہتر حق بھی کوئی ادا نہیں کر سکتا تھا، یہ کتاب اگرچہ بچوں کے لئے لکھی گئی ہے، مگر بڑے لوگوں کے لئے بھی پر لطف اور معلومات افزا ہے،

سہل تجوید، مرتبہ ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات، ۹۶ قیمت :- ۵۰ پیسے پتہ :- قاری امیر احمد علی صاحب، استاذ دار القرآت والدینیات الکلیمیۃ قریب محکمہ بلدیہ، بازار نور خاں حیدرآباد دکن نمبر ۲۴،

قرآن مجید صحیح پڑھنے کے لئے قرأت و تجوید کے فن سے واقف ہونا ضروری ہے، لائق و فاضل مؤلف نے جو اس فن کے خاص ماہر ہیں، اس مفید کتابچہ میں تجوید کے اہم اور ضروری قاعدے عام فہم اور سلیس زبان اور آسان طرز بیان میں لکھے ہیں، اور ہر فصل کے آخر میں مشقی سوالات بھی دئے ہیں، یہ کتابچہ مکاتب و مدارس کے نصاب میں شامل کئے جانے کے لائق ہے،

(ض)

جلد ۱۰۵ - ماہ محرم الحرام ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۰ء - عدد ۳

مضامین